ایک ہیبتناک ناول

تابوت

سلامت علی مہدی

ناشر :- زندے رضا مہدی
قیمت :- پانچ روپے -/5

شائع کردہ : پرواز بکڈپو۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ
طابع : یونائیٹڈ انڈیا پریس۔ لکھنؤ

مِصر کی شہزادی زلیخا ۳½ ہزار سال سے اپنے
تابوت میں سو رہی ہے ۔ اُسے مَت جگاؤ

تابوت کے جملہ حقوق بحق پرواز بکڈپو۔ نظیر آباد لکھنؤ
محفوظ ہیں

یکے از مطبوعات پرواز

پہلی بات

تابوت ایک ہیبتناک ناول ہے جو میں اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ہیبتناک ناولوں کا سلسلہ کوئی نئی بات نہیں ہے، مغربی ادب میں اس موضوع پر بے شمار ناول لکھے گئے اور ایک زمانے میں پسند بھی بہت کئے گئے ــــ لیکن اب مغربی ادب میں اس موضوع پر سنّاٹا طاری ہے اور مغرب کے ناول نگاروں کا قلم بالکل خاموش ہوگیا ہے ــــ غالباً اس لیئے کہ وہ روح کے مقابلہ میں مادّہ کو زیادہ طاقتور سمجھنے لگے ہیں۔

اُردو ادب میں یہ سلسلہ مغرب سے آیا اور ہیبتناک ناولوں کے بعض ترجمے اردو میں بیحد پسند کئے گئے ــــ میں بھی اس ادب سے بیحد متاثر تھا چنانچہ میں نے بھی اس سلسلہ کا ایک ناول زمرّد لکھا جو ہندوستان اور پاکستان کے اُردو دان طبقہ میں بیحد پسند کیا گیا ــــ

یہ زمرّد کی کامیابی ہی تھی جس نے مجھے تابوت لکھنے پر مجبور کیا، اور میں اپنے قارئین کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ یہ ناول بھی بیحد پسند کریں گے کیونکہ یہ مصر کی ایک ایسی شہزادی کی کہانی ہے جو تین ہزار سال تک ایک زندہ ممی کی صورت میں ایک تابوت میں لیٹی رہی اور اس کی روح اس انسان کو تلاش کرتی رہی جو اسے اس نیند سے بیدار کرے، ——

اور وہ بیدار ہوئی بھی —— لیکن کیسے؟ یہ آپ یہ ناول پڑھ کر ہی معلوم کر سکیں گے، ——

آپ کا اپنا

سلامت علی مہدی

باب (۱)

سورج ڈوب رہا تھا، تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور سلیم چاہتا تھا کہ جلد از جلد قطب مینار کی مضافاتی بستی مہرولی پہونچ جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی خوبصورت موٹر کی رفتار اور تیز کر دی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے آخری شعاؤں کے رقص کا منظر سلیم کو بیحد پسند تھا اس لئے اس نے موٹر کی تیز رفتاری کے باوجود مغرب کی طرف نظر ڈالی۔ سورج بتدریج ڈوب رہا تھا، سیاہ بادلوں کے ٹکڑے کسی راہب کے کالے لبادہ کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے۔ اور شفق کی سرخ و سفید شعاعیں فضا میں اس طرح کھنچی ہوئی تھیں جیسے کسی نامعلوم ہاتھ نے چند نقرئی تاروں کے ذریعہ زمین و آسمان کے درمیان کوئی رومانی رابطہ قائم کرنے کی ناکام جدّوجہد کی ہو۔

آسمان کے نیلگوں پردے پر کالی گھٹاؤں کا زور بڑھتا جا رہا تھا، قدرتی مناظر کو تاریکی نے اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا اور سلیم ہر لمحہ موٹر کی

رفتار بڑھاتا جا رہا تھا، اس کو ڈر تھا کہ بارش ضرور ہوگی اس لیے وہ چاہتا تھا کہ بارش سے قبل وہ مہرولی کی آبادی میں داخل ہو جائے۔ جہاں اسکا ایک دوست اپنے ایک تفریحی مکان میں بہت بےچینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

دفعتاً تیز ہوا چلنے لگی اور سلیم نے موٹر کی رفتار سست کر دی۔

ایک لمحہ کے لیے سلیم نے سوچا کہ مہرولی جانے کے بجائے وہ کیوں نہ اپنی کوٹھی واپس چلا جائے لیکن پھر اس نے اپنا خیال بدل دیا کیونکہ اول تو اسے اپنے منتظر دوست کا خیال آیا اور پھر اسے مہرولی کی پرسکون آبادی کا خیال آیا جو اسے دہلی کی مضافاتی آبادیوں میں سب سے زیادہ پسند تھی، اس وقت بھی وہ اپنے دوست راشد سے زیادہ مہرولی[1] کے بارے میں سوچ رہا تھا "یہ چھوٹا سا قصبہ انسانی زندگی، اس کے نشیب و فراز اور اس کے دکھ سکھ کی کتنی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس کے در و دیوار میں، اس کے کھنڈرات کے لامتناہی سلسلہ میں، اس کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی جاذب نظر شکستہ قبروں کے کتبوں میں، اس میں بنے ہوئے مہیب پھاٹکوں میں۔ تاریخی تالابوں میں اور مغل شاہزادوں کے ان عشرت کدوں میں جن کا سارا حسن اور سارا نکھار زمانہ نوچ چکا ہے۔ کتنی زبردست تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ اس آبادی میں ترک آئے، پٹھان آئے، غلام آئے، ایرانی آئے، مغل آئے۔ اور ہر ایک نے اس کو اپنی آماجگاہ بنا کر یہاں اپنی سطوت کی

---

[1] مہرولی قطب مینار کے قریب ایک پرانی بستی ہے۔

یادگاریں قائم کیں ۔۔۔ یہی تو وہ آبادی ہے جہاں پرتھوی راج نے اپنی محبوبہ رانی سنجوگتا کے لیئے ایک عالیشان محل بنایا اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں سمراٹ اشوک نے ساری دنیا تک گوتم بدھ کا پیغام نجات پہونچانے کے لیئے لوہے کی ایک بڑی لاٹ نصب کرائی ۔۔۔

اس نے سوچا "ماضی نے زمین کے اس چھوٹے سے قطعہ کو کتنی اہمیت دی لیکن آج ۔۔۔ آج نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا ہے ۔۔۔ ناہموار تنگ سڑکیں، پیچدار گلیوں میں ابھرے ہوئے بے ترتیب پتھر، ہر جانب سڑے اور ٹھہرے ہوئے پانی پر بیٹھنے والے بھنبھناتے ہوئے مچھر ۔۔۔ لیکن اس بدحالی اور زمانے کی کج روی کے باوجود یہاں کا ماحول کتنا سادہ اور زندگی کی تمام تر حقیقتوں سے کتنا قریب ہے ۔۔۔ یہاں کی ہواؤں میں کتنا ابدی سکون اور یہاں کے مناظر میں کتنی آسودگی ہے" ۔۔۔ اور پھر جیسے اس نے سوچا کہ "کہیں یہی تو وہ تمام وجوہات نہیں ہیں جن کی بنیاد پر پرتھوی راج نے سنجوگتا کے ساتھ محبت کے ازدواجی گیت گانے کے لیئے اسی مقام کو پسند کیا، اشوک نے اپنے انتہائی مذہبی جذبات کا مظاہرہ کرنے کے لیئے یہی جگہ منتخب کی اور مسلمان بادشاہوں نے اپنی سلطنت کی شان و شوکت کا دبدبہ بٹھانے کے لیئے یہیں اپنی یادگاریں قائم کیں" ۔۔۔

موٹر چلاتے چلاتے سلیم نے مزید سوچا "جب مہرولی کا دن اتنا رومان انگیز اور شام اتنی کیف آور ہوتی ہے تو پھر یہاں کی رات کتنی حسین ہوگی ۔۔۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں رات کی تاریکی میں روحیں بھی آتی ہوں وہ روحیں ۔۔۔

جو اپنی زندگی میں ناکام رہی ہوں ۔۔۔ وہ روحیں جن کی تمنائیں ادھوری رہ گئی ہوں ۔۔۔ وہ روحیں جن کے محبت بھرے گیتوں نے خود ان کی نگاہوں کے سامنے دم توڑ دیا ہو ۔۔۔ وہ روحیں ۔۔۔ جو اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لے سکی ہوں ۔۔۔ اور وہ روحیں جنھوں نے اپنے خاکی جسم چھوڑنے کے بعد بھی اپنے جسم سے اپنا پیار نہ ختم کیا ہو ۔۔۔"

اور جیسے ان بھٹکی ہوئی روحوں کا تصور کر کے سلیم کانپ گیا ۔۔۔ راستہ کتنا سنسان ہے ۔۔۔ تاریکی کتنی مہیب ہے ۔۔۔ اور مہرولی ابھی چار میل دور ہے "نہیں نہیں وہ اس راستہ سے مہرولی نہیں جائیگا ۔۔۔ وہ اس طرف سے نہیں جائیگا جدھر کچھ آبادی بھی ہو اور صرف موت کے نہیں زندگی کے بھی آثار ہوں ۔۔۔" اور سلیم نے یہ فیصلہ کرتے ہی اپنی موٹر ایک کچے راستے پر موڑ دی ۔۔۔

دور بہت سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آئیں اور سلیم کو ایسا لگا جیسے بہت سی بھٹکی ہوئی روحوں نے ایک ساتھ بین شروع کر دیا ہو ۔۔۔ اس کے ہاتھ کپکپا گئے ۔۔۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ سلیم خود اپنے آپ پر مسکرا دیا "ہنوز روح اسی وقت تک طاقتور رہے جب تک اس کے پاس جسم ہے ۔۔۔ جسم کے بغیر روح بالکل ایسی ہی نرم و نازک شئے ہے جیسے پھول کے بغیر اسکی مہک ۔۔۔ جو پھول کے جسم سے نکلنے کے بعد باقی تو رہتی ہے لیکن اس طرح کہ خود اس کے وجود کی کوئی اہمیت اور افادیت نہیں رہتی ۔۔۔"

"لیکن یہ روح ہے کیا ۔۔۔؟" اس کے ذہن نے اس سے سوال کیا اور

جواب کی تلاش میں وہ خود ہی اپنے ذہن کے تانے بانے میں الجھ کے رہ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اچھی یا بُری روح کے مسئلہ میں الجھ کر رات کی خوشگوار ساعتیں برباد کرے اس لیئے وہ دوبارہ مہرولی کے بارے میں سوچنے لگا۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "کچھ بھی ہو۔۔۔ یہ سمجھنا اور فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ اس خوبصورت اور چھوٹے سے قصبہ کی تاریخی معماری میں کس نے زیادہ حصّہ لیا۔ ہندو راجاؤں نے جن کا تذکرہ سنسکرت کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے یا مسلمان شہنشاہوں نے جن کی تہذیب، جن کی معماری ذہانت اور جن کا تمدن و ادب آج بھی کسی نہ کسی صورت میں یہاں موجود ہے اور جن کی زندگی کے بہت سے اسرار سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر آج بھی مہرولی کے سن رسیدہ مولویوں اور کسی مزار کے مجاوروں کے دلوں میں محفوظ ہیں"

سلیم کی کار کبھی کبھی پتھروں سے ٹکرا کر یا گڈھوں میں اتر کر ہچکولے کھا جاتی تھی لیکن اس کے خیالات کا سلسلہ بدستور قائم رہا "یہ خوبصورت، اٹھتا ہوا، ابھرتا ہوا، فضا میں بلند ہوتا ہوا اور آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ہوا مینار آخر کس کا مان لیا جائے۔۔۔ مسلمان مورخین نے تاریخی دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ التمش ایک بہترین معماری ذہانت کا حامل تھا اور اس کے اسی ذہن کی تمام تر قوتیں مدتوں جد و جہد کرتی رہیں تب جا کر یہ قطب مینار عالم وجود میں آیا۔۔۔ لیکن اس کے بالکل برعکس پنڈت ہردیو سہائے دہلوی کا دعویٰ ہے کہ یہ تمام عمارتیں ان راجاؤں اور مہاراجاؤں کی ہیں جو مسلمان حملہ آوروں

کی آمد تک اس خطۂ زمین پر حکمران رہے ۔ بہر حال "سلیم نے جیسے فیصلہ کیا
ان کھنڈرات میں مسلمان شہنشاہوں کی تہذیب اور ان کی شان و
شوکت دفن ہو یا پرانے راجاؤں اور مہاراجوں کی کہانیاں ۔ یہ چھوٹی
سی دنیا ہے بہت پیاری ۔ آج بھی یہ بستی چاندنی میں بھیگی ہوئی ایسی
زندگی معلوم ہوتی ہے جس میں حرکت نہ ہو ، رقت نہ ہو ، شور نہ ہو ، ہنگامہ
نہ ہو ۔ صرف سکون ہو اور یہ سکون اتنا ابدی اور اتنا خوابناک ہو کہ
دل میں ماضی کی تصویریں اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ دکھائی دیں
۔ اور جیسے یہ قصبہ کوئی قصبہ نہ ہو چاندنی اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی
ایک ایسی دنیا ہو جس میں لطیف و پاکیزہ روحیں آباد ہوں ، اور
جہاں بے آواز وقت ماضی اور مستقبل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس طرح
گذرتا ہو جس طرح حیات انسانی کے دن ۔

اب راستہ بھی خراب ہو گیا تھا اور تاریکی بھی کافی بڑھ گئی تھی ، سڑک
پر دور دور تک ایک متنفس بھی نہیں نظر آتا تھا جبکہ اس سڑک پر آمد و رفت
ہمیشہ رہتی تھی ، تنہائی کے ان احساسات نے فطری طور پر سلیم کو فکرمند کیا
اور اس نے موٹر کی رفتار تیز کی ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اچانک اسے
محسوس ہوا کہ وہ اپنے خیالات میں کھو کر غلط راستہ پر آ گیا ہے کیونکہ یہ راستہ
قطب مینار کے بجائے چراغ[1] دہلی کی طرف جاتا تھا ۔ چنانچہ اگلے چوراہے
پر اس نے اپنی موٹر گھمائی اور اس سڑک پر پوری تیز رفتاری سے چھوڑ دی

---

[1] چراغ دہلی بھی دہلی کی ایک مضافاتی آبادی ہے اور یہاں ایک مشہور بزرگ کا مزار ہے

جو بند آنکھوں کے ساتھ بھی اس کو سیدھی مہرولی پہونچا سکتی تھی۔

اسی سڑک پر جبکہ وہ مہرولی کو اپنی منزل بنائے تیزی سے جا رہا تھا اچانک اسے بیچ سڑک پر ایک آدمی چلتا ہوا دکھائی دیا۔ حادثہ کے خوف سے اس نے ہارن بجایا ہارن کی آواز سنتے ہی یہ آدمی ایک کنارے ہو کر کھڑا ہو گیا اور جب سلیم کی موٹر اس کے قریب سے گذری تو اس نے دیکھا یہ شخص ایک نیلے چغہ سے اپنا پورا جسم چھپائے ہوئے ہے سر پر عمامہ نما کوئی شئے ہے اور بائیں شانے پر ایک ایسا عربی رومال پڑا ہے جو عموماً قاری، حاجی یا حافظ استعمال کرتے ہیں۔

"اس تنہا، سنسان اور تاریک راستہ پر یہ اجنبی کون ہو سکتا ہے"

سلیم نے سوچا۔ اس کے خدوخال تو مصریوں سے ملتے جلتے ہیں، ویسا ہی سنہرا رنگ، اونچی ناک، چوڑی پیشانی، لمبا قد۔ اور طاقتور ہاتھ پیر"

ایک مرتبہ پھر اس اجنبی کو دیکھنے کا خیال سلیم کے ذہن میں پیدا ہوا اور اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر پیچھے کی جانب دیکھا بھی لیکن تاریکی اور موٹر کے پہیوں سے پیدا ہونے والے گرد و غبار نے اس اجنبی کو اس کی نگاہوں نے بالکل مستور کر دیا تھا۔

سلیم نے موٹر کی رفتار پھر تیز کر دی۔

لیکن مصری خدوخال والا یہ پُر اسرار اجنبی بدستور اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ اور اسکی واحد وجہ یہ تھی کہ اس کے دل میں ہمیشہ سے مصر کے اسرار چھائے رہتے تھے، مصر کے بن دیکھے قدیم حسن کا سحر اس پر ایک

عرصہ سے طاری تھا، تاریخ کے اوراق میں گمشدہ مصر کی ہر شہزادی قلوپطرہ بن کر اس کے خیالات کی وسعتوں میں سما گئی تھی، اور بچپن ہی سے مصر کا حسن اور مصر کے قدیم اسرار اس پر اپنا جادو پھیلا رہے تھے۔

قدیم مصر ہمیشہ سے اس کا ایک انجانا خواب رہا تھا، کیونکہ اس کے والد خان بہادر عازم الدین کو جو ایک کروڑپتی تاجر تھے ان کو مصریات سے دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ انھوں نے کشمیری ورداہ کے باہر اپنی تعمیر کردہ نئی کوٹھی کو صرف مصر کی قدیم چیزوں سے سجایا تھا، اسکی دیواروں پر قدیم مصر کے طرز پر تصویریں بنوائی تھیں اور اپنی لائبریری کو مصری عجائبات و نوادرات کا ایک عجائب گھر بنا دیا تھا، عازم الدین کی قدیم مصر سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اس شوق پر لاکھوں روپیہ خرچ کر چکے تھے اور ان کی کوٹھی کا آرائش کا مصری انداز دیکھ کر کوئی شخص یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ کسی مصری رئیس کی کوٹھی نہیں ہے۔

باپ کے اس شوق کا اثر سلیم کے ذہن پر بھی پڑا تھا۔ بچپن ہی سے وہ مصری عجائبات دیکھ رہا تھا، ابوالہول اور اہرام کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ مختلف مجسمے دیکھ رہا تھا۔ قدیم مصری زبانوں کے کتبے دیکھ رہا تھا اور اب جب کہ وہ خود تعلیم سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھ چکا تھا اس نے خود مصر سے دلچسپی شروع کر دی تھی۔ وہ مصر کے قدیم اسرار اور اسکی تہذیب سے تو متاثر تھا ہی لیکن جوان ہونے کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ متاثر شہزادیوں کی ان خوبصورت تصاویر سے تھا

جو اسکی لائبریری میں لٹکی ہوئی تھیں اور جن کو وہ عالم محویت میں گھنٹوں دیکھا کرتا تھا۔

عالم تصور میں وہ مصر کی سیر کرتا ہوا موٹر چلاتا رہا۔ اچانک بادل گرجے، بجلی چمکی اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ رفتار دھیمی کر کے اس نے موٹر کی اگلی دونوں بڑی بتیاں جلا دیں۔ اور اس روشنی میں یہ دیکھ کر اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ ایک اونچی دیوار کے بالکل قریب ہے۔ تعجب اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ موٹر آگے بڑھاتا رہا۔ اچانک خوفناک گرج کے ساتھ بجلی پوری شدت کے ساتھ چمکی۔ اور اس کی تیز روشنی میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کو ہی نہیں دنیا کے ہر ذی ہوش کو دیوانہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر پتھر کا ایک پرانا مکان تھا جس کے ایک برج کے نیچے ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے جسم پر سیاہ لباس تھا سنہرے بال ہوا میں اڑ رہے تھے، سفید رنگ بجلی کی روشنی میں چاند کی طرح چمک رہا تھا اور آنکھیں کنول کے پھول کی طرح جوانی سے مخمور تھیں۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اور یہ وہی شہزادی تھی۔ مصر کی شہزادی۔ وہی جس کی تصویر سلیم کی لائبریری کی ایک دیوار پر سجی تھی۔ قدیم مصر کی شہزادی۔ جس پر ہمیشہ اسکی محبت بھری نظریں پڑا کرتی تھیں۔ اور جو بچپن سے لیکر اب تک اس کے ذہن کے ہر گوشے پر چھائی ہوئی تھی۔ اسکی آن دیکھی محبوبہ کی طرح۔ زندگی کے دلکش خواب کی طرح۔ قدیم مصر کے اسرار کی طرح۔

اور وہ چیخ پڑا ــــ "تم کون ہو ــــ" اور یہ کہتے ہی اس پر ایک عجب وارفتگی سی طاری ہو گئی ــــ کچھ دیوانگی اور لاشعوری سی کیفیت، موٹر کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ــــ ڈگمگاتی ہوئی موٹر ایک مہیب آواز کے ساتھ کسی درخت سے ٹکرائی، اور وہ اچھل کر باہر گر پڑا ــــ

وہ بالکل بیہوش تھا ــــ

اور اسکی زندگی کے دلکش خواب کی دلفریب تعبیر اسے موت کے قریب لے گئی تھی ؟

باب ـــــــــــ ۲

سلیم نے بہت آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں ۔ ایک لمحہ کے لئے سامنے کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں ۔ یقیناً کوئی بات ضرور تھی ، وہ حلفیہ کہہ سکتا تھا کہ آنکھیں کھولنے سے صرف ایک منٹ پہلے وہ مصر کی کسی عالیشان عمارت کے ایک ستون سے کمر لگائے بیٹھا ہوا ایک معبد کی کھڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا ۔ جو دیوار میں کافی بلندی پر تھی اور جس میں ایک حسن جہانسوز راہبہ اپنے انتہائی مقدس لباس میں کھڑی ہوئی پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھی ۔ دھیرے دھیرے روشنی کم ہونے لگی اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر اس پھیلتی ہوئی تاریکی نے حسن کے اس عدیم المثال پیکر کو اسکی نظروں سے پنہاں کر دیا ۔

اور اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھول دیں ۔ اس لیئے کہ وہ دوبارہ یہ

منظر نہیں دیکھ سکا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ وہ ایک صاف ستھرے کمرے میں ایک سفید بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، سارا جسم درد سے بیچین ہے اور قریب کی ایک میز پر دوائی کی شیشیاں، کچھ پیالے اور گلاب کے تازے پھولوں سے سجا ہوا ایک گلدستہ رکھا ہوا ہے۔ تکان محسوس ہونے پر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

سلیم کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے یا نہیں۔ ابھی تک اس پر ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی کہ ایک ملائم، نازک لیکن سرد ہاتھ کی لمس اپنی پیشانی پر اسے محسوس ہوئی اپنی آنکھوں کے پُرسکون پردوں کو تیسری بار اس نے آہستہ آہستہ اٹھایا اور اب اس نے دیکھا کہ محبت اور شفقت کے جذبات سے لبریز دو نرگسی آنکھیں اسکی طرف دیکھ رہی ہیں۔ تھکی تھکی نگاہوں کے ساتھ اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ اور اب اسے معلوم ہوا کہ وہ کسی اسپتال میں ہے، اس کے قریب ایک نرس کھڑی ہوئی ہے۔ اور وہ ایک ایسے کمرے میں ہے جس میں نرس کی بڑی بڑی آنکھوں اور گلاب کے سرخ پھولوں کے علاوہ ہر چیز سفید ہے۔

"شکر ہے کہ بالآخر آپ ہوش میں آ ہی گئے" نرس نے دل آویز آرام دہ ہلکی آواز میں خوش ہو کر کہا۔

سلیم نے چاہا کہ جواب میں ہاں کہے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے حلق سے کوئی آواز نہ نکال سکا۔ اس نے اپنی عمر کے کسی حصے میں بھی خود کو

اتنا نحیف و کمزور نہیں محسوس کیا تھا۔ لیکن کمزوری، نقاہت، درد اور تکلیف کے باوجود ایک مرتبہ پھر اس کا ذہن مہرولی جانے والی سڑک کے کنارے برج کے نیچے کھڑی ہوئی اس پُر اسرار زندہ عورت کی طرف چلا گیا۔ جس کی تصویر اس کی لائبریری میں موجود تھی، جس کو وہ اپنے بچپن سے دیکھ رہا تھا اور جس کے بارے میں اسے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ فرعون دوم کے خاندان کی کسی خوبصورت شہزادی کی ایک قدیم تصویر ہے اور جسے اس کے باپ نے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے مصری نوادرات کے کسی تاجر سے خریدا تھا۔

سلیم کے چہرے پر بےچینی اور تکان کے آثار دیکھ کر نرس نے اپنی عجیب آواز میں کہا۔ "یہ دوا پی لیجئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آپ اپنی طبیعت میں ایک حیرتناک خوشگوار تبدیلی محسوس کریں گے۔"

اور یہ دوا پیتے ہی سلیم سو گیا۔

رات گئے اسکی آنکھ کھلی، اب واقعی درد کم تھا، طبیعت کی گرانی دور ہو چکی تھی اور وہ خود کو آرام میں محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہی نرس اس کے پلنگ کے بالکل قریب ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سلیم نے غور سے چاروں طرف دیکھا اور اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد کہ وہ واقعی کسی اسپتال کے کمرے میں ہے نرس سے پوچھا

"میں یہاں کیسے آیا۔"

"تغلق آباد کے کھنڈروں والی سڑک پر آپ کی موٹر ایک درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی اور ایک عورت آپ کو یہاں تک پہونچا گئی ہے۔"

اس وقت آپ اِرون اسپتال میں ہیں اور خطرہ کی حد سے نکل چکے ہیں۔" نرس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"اتنا تو مجھے خود یاد ہے کہ میری موٹر کو حادثہ ہو گیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کون عورت مجھے یہاں تک پہونچا گئی؟" سلیم نے گھبرا کر پوچھا اور ایک مرتبہ پھر اُسے اپنی لائبریری والی مصری شہزادی کی تصویر یاد آ گئی۔

سلیم کے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے نرس کی تیوریوں پر خفیف سے بل پڑ گئے اور اس نے تقریباً تحکمانہ انداز میں کہا۔ "مسٹر سلیم ڈاکٹر بیگ کے حکم سے آپ کو زیادہ گفتگو کرنے کی اجازت قطعی نہیں دی جا سکتی۔ اب آپ دوا پیجئے اور آرام کیجئے۔"

"لیکن نرس تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" سلیم نے انتہائی حیرت سے پوچھا کیونکہ وہ بیہوشی کے عالم میں یہاں پہونچایا گیا تھا اور کسی کو اسکا نام تک نہیں معلوم تھا۔

"یاد رکھیئے کہ میں آپ کے اس آخری سوال کا جواب دے رہی ہوں اس کے بعد آپ بالکل خاموش رہیئے گا۔ سنیئے۔ جس عورت نے آپ کو یہاں تک پہونچایا تھا اسی نے رجسٹر پر آپ کا نام اندراج کرایا، اسی نے بتایا کہ آپ کا نام سلیم الدین ہے اور آپ کے والد کا نام خان بہادر عازم الدین ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ آپ کی شکستہ حال موٹر بھی نئی دہلی کے حمید گیرج میں مرمت کے لیئے پہونچا دی جائے گی۔ اس عورت نے خود اپنا کوئی پتہ نہیں بتایا اور ہمارے مزید کسی سوال کا جواب دیئے بغیر اٹھی چلی گئی۔"

نرس نے ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے کے انداز میں اپنا پورا جملہ ادا کیا ——
اور سلیم کے ماتھے پر پسینہ آگیا ——.

"یقیناً یہ کسی روح کا کام ہے ——. ورنہ کسی اجنبی کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں، میرا نام کیا ہے اور میں کس کا بیٹا ہوں ——". سلیم نے سوچا اور خوف کی وجہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں ——. وہ چاہتا تھا کہ کچھ اور سوچے اور نرس اس کے کچھ اور سوالوں کا جواب دے —— لیکن غالباً نرس اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی الجھنوں کو پہچان گئی اس نے سلیم کو دوا پلائی اور ایک مرتبہ پھر التجا بھرے انداز میں سونے کے لیے کہا —— لیکن سلیم کی آنکھوں میں نیند کہاں ——. اس نے محض نرس کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں ——. ذہنی اعتبار سے وہ ماضی کے ان تمام واقعات پر مسلسل سوچ رہا تھا —— اور اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ سب کیسے ہوا؟

رات اسی طرح گذرتی رہی ——. اور لاتعداد الجھنوں کو دل میں دبائے سلیم بھی سو گیا ——. اور جب وہ بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ سورج کی روشنی پھیل چکی ہے اور نرس کے قریب ایک بوڑھا ڈاکٹر بھی کھڑا ہوا ہے، —— قبل اس کے کہ سلیم کوئی سوال کرتا ڈاکٹر نے انتہائی مشفقانہ انداز میں گفتگو کی ابتدا کر دی۔ اس نے کہا "آپ گذشتہ ۴۸ گھنٹے سے ہمارے اسپتال کے ایک اسپیشل وارڈ میں زیر علاج ہیں ——. ایک گمنام عورت انتہائی زخمی حالت میں آپ کو یہاں تک پہونچا گئی، یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کو بروقت طبی امداد مل گئی اور ہمیں آپ کے والد کا نام معلوم ہو گیا

ورنہ آپ کا بچنا محال ہو جاتا"

"لیکن میرے والد اس وقت کہاں ہیں؟"

"وہ خود میرے دفتر میں آپ سے ملاقات کے لیے بیچین ہیں۔ آپ اطمینان سے لیٹے رہیے، میں ابھی ان کو یہاں بھیجتا ہوں۔" ڈاکٹر نے ہمدردی سے جواب دیا اور سلیم کے سر پر بندھی ہوئی پٹیوں کا معائنہ کرنے نیز نرس کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

چند ہی لمحات کے بعد خان بہادر عازم الدین اس کے کمرے میں بیتابی کے ساتھ داخل ہوئے اور انھوں نے آتے ہی سلیم کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔

"میرے بیٹے۔ اب تم کیسے ہو؟ خدا کی قسم میں تمام رات تمھارے وارڈ کے آگے بیٹھا رہا۔ یہ تمھاری موٹر کو حادثہ کیسے ہو گیا؟ تم تغلق آباد کے کھنڈروں میں کیا کرنے گئے تھے؟ وہ کون عورت تھی جو اپنا نام اور پتہ بتائے بغیر تمھیں یہاں تک پہونچا گئی؟ جلد بتاؤ سلیم یہ سب کیوں ہوا؟" خان بہادر نے ایک ہی سانس میں لاتعداد سوالات کر ڈالے۔

"میں اچھا ہوں ابا جان۔" سلیم نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا "لیکن خدا کی قسم جس حادثہ سے دوچار ہوا ہوں اس نے ذہنی اعتبار سے مجھے بالکل معطل کر دیا ہے۔"

"مجھے بتاؤ۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی الجھن دور کرنے کے لیے میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔" عازم الدین نے بیٹے کی پریشانی دیکھکر کہا۔

سلیم نے اپنے باپ کو شروع سے لیکر اب تک کے تمام واقعات سنا دیئے

—— اور عازم الدین تفصیل سن کر انگشت بدندان رہ گئے ——

انھوں نے سوچا ——"کیا یہ ممکن ہے ——؟" اور پھر خود ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ "سب کچھ ممکن ہے کیونکہ سلیم جس شہزادی کی تصویر کا تذکرہ کر رہا ہے وہ قدیم مصری تاریخ کے بموجب ابتک زندہ ہے۔" عازم الدین نے اپنے بیٹے کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا "دنیا یقین کرے یا نہ کرے لیکن مجھے اس امر پر پورا یقین ہے کہ برج والی عورت وہی ہو گی جس کی تصویر میری لائبریری میں موجود ہے۔ مجھے مصریات سے دلچسپی ہے میں اس شہزادی کی پوری کہانی جانتا ہوں —— تم اچھے ہو کر ہسپتال سے آجاؤ پھر میں تمھیں اپنے ساتھ لیکر حادثہ کی مکمل تحقیقات کرونگا ——"

"جب آپ کو اس شہزادی کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ اب تک زندہ کیوں ہے ——" سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اب تک زندہ کیوں ہے یہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن اسکا نام شہزادی زلیخا ہے یہ میں تمھاری تسلی کے لیے بتائے دیتا ہوں ——" عازم الدین نے پُرسکون انداز میں کہا "اور اب تم آرام کرو —— میں ڈاکٹر بیگ سے گفتگو کرنے کے بعد چلا جاؤں گا اور شام کو پھر آؤں گا"

اور یہ کہہ کر باپ نے بیٹے کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا اور ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر بیگ مریضوں میں مصروف تھے لیکن پھر بھی انھوں نے عازم الدین

سے گفتگو کرنے کے لیے وقت نکال ہی لیا۔

"اب آپ سلیم کے لیے فکر مند نہ ہوں کیونکہ اب انھیں کوئی خطرہ باقی نہیں ہے" ڈاکٹر بیگ نے عازم الدین کے چہرے پر تفکرات کا ہجوم دیکھ کر کہا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ میں اس کے ظاہری جسموں کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں لیکن ۔۔۔ اپنی آئندہ زندگی میں اسے جن خطرات سے دوچار ہونا ہے ان کی فکر مجھے ضرور لاحق ہے" عازم الدین نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" ڈاکٹر بیگ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ آپ میرے پرانے ملنے والے ہیں، آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے مصر کی قدیم تاریخ اور اس کے اسرار سے دلچسپی ہے اور اپنے اس شوق کی تسکین کے لیے میں لاکھوں روپیہ بھی برباد کر چکا ہوں ۔۔۔ سلیم نے حادثہ کی جو تفصیل مجھے بتائی ہے اسکی روشنی میں مجھے مجبوراً یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ قدیم مصر کی ایک خوبصورت عورت شہزادی زلیخا کی روح سلیم میں دلچسپی لے رہی ہے ۔۔۔

شہزادی زلیخا کو میں اس لیے جانتا ہوں کہ اسکی تصویر میری لائبریری میں موجود ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اب تک زندہ ہے ۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ایسے افراد جو صرف مادّہ اور اسکی ٹھوس حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں نہ تو سلیم کی باتوں پر یقین کریں گے اور نہ میری گفتگو پر ۔۔۔ اس لیے میں

آپ سے بحث کرنے کے بجائے آپ سے صرف امداد چاہتا ہوں۔" عازم الدین نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر بیگ کی طرف دیکھا۔

خان بہادر عازم الدین ایسے ذمہ دار اور سنجیدہ آدمی کی زبان سے اس قسم کی غیر یقینی باتوں کو سن کر واقعی ڈاکٹر بیگ کو حیرت ہوئی اور وہ خود تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ اس حکایت پر یقین کرے اور یا پھر نہ کرے۔ اور پھر اس نے سوچا کہ یقین کر لینے میں چونکہ کوئی نقصان نہیں ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ خان بہادر کی دل شکنی نہ کرتے ہوئے نہ صرف ان کی باتوں میں دلچسپی لے بلکہ اس مسئلہ میں ان کی مدد بھی کرے۔

ڈاکٹر بیگ کو بہر حال روحانیت پر کوئی یقین نہ تھا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل سچ اور حقائق پر مبنی ہے۔" ڈاکٹر بیگ نے مصنوعی جذبات کے ساتھ کہا۔ "اور میں حادثہ کی تحقیقات کے سلسلے میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ بہت بہت شکریہ۔" عازم الدین نے خوش ہو کر کہا۔ "اب آپ میرے صرف چند سوالوں کا جواب دے دیں۔ پہلے یہ بتائیں کہ جس وقت کوئی نامعلوم اور گمنام عورت سلیم کو اسپتال میں داخل کرنے آئی۔ کیا آپ موجود تھے؟"

"ہاں۔ ایک آپریشن کے سلسلے میں مجھے دیر ہو گئی تھی اور میں اتفاقاً اس وقت موجود تھا۔"

"سلیم کو کسی گاڑی میں لایا گیا تھا یا موٹر میں ـــ ہے" عازم الدین نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ عورت سلیم کو بیہوشی کے عالم میں ایک گھوڑا گاڑی میں جو فٹن سے مشابہ تھی یہاں تک لائی ـــ آتے ہی اس نے کہا کہ خان بہادر عازم الدین کے لڑکے سلیم الدین کی موٹر کا تعلق آباد کے کھنڈرات میں حادثہ ہو گیا ہے شکستہ موٹر نئی دہلی کے حمید گیرج میں پہونچا دی گئی ہے اور سلیم بیہوشی کی حالت میں باہر گاڑی پر موجود ہے ـــ میں آپ کا نام سنتے ہی باہر آیا ـــ اور عملہ کے چند آدمیوں کی مدد سے سلیم کو گاڑی سے باہر نکالا ـــ اور عورت کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اسے اسپیشل وارڈ میں لے آیا ـــ"

"اس کے بعد ـــ" عازم الدین کی بیچینی بڑھ گئی۔

"اس کے بعد مریض کا معائنہ ختم کر کے جب میں نے اس عورت کو بلوایا ـــ تو وہ جا چکی تھی چنانچہ میں نے فوراً آپ کو فون پر اطلاع دی اور حمید گیرج بھی فون کیا کہ کیا کوئی موٹر اس کے گیرج میں پہونچائی گئی ہے ـــ وہاں سے موٹر کی وصولیابی کا اقرار ہو ہی تھا کہ چند منٹ کے بعد آپ خود آ گئے ـــ"

"ہوں ـــ" عازم الدین نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا ـــ "صرف ایک سوال اور"

"فرمایئے ـــ" ڈاکٹر بیگ نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔

"فٹن کے گھوڑوں کا رنگ کیا تھا ـــ"

"سیاہ ۔ بالکل سیاہ ۔۔ اور اس کو چوان ایک نیا چغہ پہنے ہوئے تھا"

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا ڈاکٹر بیگ ۔۔ واقعی شہزادی زلیخا فرعون کے دورِ حکومت میں جس فٹن پر سیر کرنے نکلتی تھی اس کے گھوڑوں کا رنگ سیاہ تھا"۔

اور عازم الدین کے اس جواب پر ڈاکٹر بیگ ایک مرتبہ پھر حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا ۔۔ اور ایک لمحہ کے لیئے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ دونوں باپ بیٹے پاگل تو نہیں ہو گئے ۔۔ ورنہ ۲½ ہزار سال گزرنے کے بعد بھی ایک عورت کی زندگی اور پھر اسکی یہ تمام سرگرمیاں ۔۔ نہیں نہیں میں ان لغو باتوں پر یقین نہیں کر سکتا ۔۔ میں ان باتوں کو ایک کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا ۔۔ شہزادی زلیخا کا وجود ممکن ہے ۔۔ لیکن شہزادی زلیخا آج بھی زندہ ہے یہ میں ہرگز نہیں مان سکتا ۔۔"

ڈاکٹر بیگ انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ عازم الدین چلا گیا۔

باب ــــــــــ ۳

ایک ہفتہ کے علاج معالجہ کے بعد سلیم ہسپتال سے گھر واپس آگیا، لیکن حادثہ کے سلسلہ میں اسکی الجھنوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ بیماری کے زمانہ میں ایک لمحہ کے لیئے بھی اس کے ذہن سے مصری شہزادی کی تصویر نہیں نکلی ــــ نیند تو نیند عالم بیداری میں بھی جب بھی وہ آنکھیں بند کرتا اس کو تغلق آباد کے کھنڈروں کے ایک برج میں سنہرے بالوں والی ایک خوبصورت عورت اسکی طرف دیکھتی نظر آتی اور وہ گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیتا۔

عازم الدین نے بھی اسے منع کر دیا تھا کہ وہ مکمل صحت یابی تک اس سے مصری شہزادی کے بارے میں کوئی بات نہیں کریگا۔ چنانچہ مسلسل ایک ہفتہ تک سلیم کے جذبات اندر ہی اندر گھٹتے رہے اور وہ اسقدر بیتاب ہو گیا کہ ابھی زخم کی مرہم پٹی ہو ہی رہی تھی کہ وہ ہسپتال سے نکل بھاگا۔

کوٹھی میں داخل ہوتے ہی وہ سب سے پہلے لائبریری میں گیا اور وہاں اسی تصویر پر نگاہ ڈالی جس نے اسکی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

شہزادی زلیخا کی یہ تصویر بھی نادر روزگار تھی۔ تصویر میں شہزادی باریک لباس میں اس طرح ملبوس تھی کہ اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز نمایاں تھے، سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے، ماتھے پر موتیوں کی ایک لڑی بکھری ہوئی تھی، گلے میں سونے کا ایک باریک سا نپ تھا۔ لبوں پر ایک ابدی اور لافانی مسکراہٹ تھی اور ایک ہاتھ میں نیلے گلاب کا ایک تازہ پھول۔ تصویر کے پس منظر میں ایک معبد گاہ تھی جس کے بڑے دروازے پر ابوالہول کا ایک چھوٹا سا مجسمہ نصب تھا۔

سلیم عالم محویت میں نہ معلوم کتنی دیر تک اس تصویر کے نزدیک کھڑا رہا کہ اچانک لائبریری کا دروازہ کھلا اور اس کے باپ عازم الدین نے دوڑ کر اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگا لیا،

"مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ ہسپتال سے آتے ہی تم سب سے پہلے اسی تصویر کو دیکھو گے۔" عازم الدین نے انتہائی مشفقانہ انداز میں کہا اور سلیم ایک محجوب مسکراہٹ کے علاوہ اپنے باپ کو کوئی جواب نہ دے سکا۔

عازم الدین اور سلیم ایک دوسرے کے بالکل مشابہ تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کے بال ریشم کی طرح سفید ہو چکے تھے اور دوسرے کے سر پر سیاہ بالوں کی ترتیب قائم رہتی تھی، ایک کے چہرے پر بڑھاپے کا تجربہ اور اسکی لکیریں تھیں اور دوسرے کے چہرے پر جوانی کی سرخی اور تازگی تھی، دونوں

صحت کے اعتبار سے جسیم تھے، رنگ و روغن دلکش تھا، اور خدوخال میں ایک خاص قسم کی رعنائی اور دلکشی تھی۔ سلیم حسن مردانہ کا ایک اچھوتا نمونہ تھا ـــ اور عازم الدین جاتی ہوئی جوانی کا ایک زندہ مجسمہ۔

دونوں باپ بیٹے اس وقت جس لائبریری میں موجود تھے وہ کسی ہندوستانی رئیس کی لائبریری ہونے کے بجائے برطانوی میوزیم کا وہ کمرہ معلوم ہوتی تھی جس کو مصری آثارِ قدیمہ سے آراستہ کیا گیا ہو۔ مصر سے عازم الدین کی دلچسپی بہت پرانی تھی، اور جب سے اس کی بیوی سلیم کو سات سال کی عمر میں چھوڑ کر لحد کے گوشے میں سو گئی تھی عازم الدین بالکل ہی قدیم مصر کے اسرار کا بن کر رہ گیا تھا۔ یہی شوق اس کا غم غلط کر رہا تھا، اور اسی شوق نے اسکی بیوی کی جدائی کے زخم پر گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ مرہم کا کام کیا تھا۔ مصر کے اسرار میں کھو کر وہ اپنی محبوب بیوی کو بھول جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس نے تمام عمر دوسری شادی نہیں کی۔

ساری زندگی کی جد و جہد کے بعد عازم الدین نے مصر کے آثارِ قدیمہ کا جو مجموعہ اکٹھا کیا تھا وہ قدیم مصری تہذیب کا ایک خزانہ تھا جو پورے ملک میں اس کے علاوہ اور کسی کے پاس نہ تھا۔ یہ مجموعہ صرف لائبریری کی آرائش تک ہی محدود نہ تھا بلکہ کوٹھی کا ہر کمرہ مصری تہذیب کا گہوارہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ دور دور سے لوگ اس کوٹھی کو دیکھنے آتے تھے اور اس طرح اگر ایک طرف عازم الدین کی شہرت میں اضافہ ہو گیا تھا

تو دوسری طرف اس کی ایسے لوگوں سے بھی واقفیت ہوگئی تھی جو مورخ تھے، ڈاکٹر تھے، آثار قدیمہ کے ماہر تھے، اور علوم و فنون کے پروفیسر تھے۔

کوٹھی کا جملہ انتظام عازم کی بیوہ بہن شمیم بانو کے سپرد تھا جو بیوہ ہونے کے بعد اپنی زندگی کے پرسکون دن اپنے بھائی کے ساتھ گذار رہی تھی اور سلیم سے اپنے بیٹے سے زیادہ محبت کر رہی تھی۔ الغرض کوٹھی کی اندرونی زندگی میں اب تک کوئی انتشار نہ تھا، کوئی اضطراب نہ تھا، کوئی الجھن نہ تھی۔ خان بہادر کا کاروبار اپنے انتہائی عروج پر تھا اور وہ ہر اعتبار سے دنیا کے خوش نصیب ترین انسانوں میں سے ایک تھے۔

لیکن ـــ اب ایک نیا طوفان ان کے دروازہ پر دستک ضرور دے رہا تھا۔

دونوں باپ بیٹے شہزادی زلیخا کی تصویر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئے اور عازم الدین نے کہا "مجھے تعجب صرف یہ ہے کہ شہزادی زلیخا کی روح دوبارہ تم سے ملنے کیوں نہیں آئی ـــ یہی نہیں ـــ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اس نے اپنی جھلک دکھانے کے لیے تغلق آباد کے کھنڈروں کو ہی کیوں پسند کیا ـــ اگر وہ تم سے ملنا ہی چاہتی تھی تو کسی بھی تاریک رات کو تمھاری خوابگاہ میں تم کو جگا سکتی تھی۔"

"اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ اتنے پُراسرار اور تاریک ماحول میں مجھے اپنی جھلک کیوں دکھانا چاہتی تھی۔" سلیم نے کہا۔

"صرف اس لیے کہ تم اس پر عاشق ہو جاؤ۔" عازم الدین نے کہا

— "اور میرے خیال میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئی ہے۔ کیونکہ جہاں تک میرا تجربہ بتاتا ہے تم حادثہ کے بعد سے اب تک صرف اُسی کے خیال میں ڈوبے رہتے ہو۔"

"لیکن مجھے خود پر عاشق کرانے کا بھی تو کوئی مقصد ہو گا"

"بہت اہم مقصد ہے شہزادی زلیخا کا — اور اس مقصد کی ایک لمبی کہانی بھی ہے۔ جو میں اپنے چند احباب کے آنے کے بعد تمھیں اور سب کو سناؤں گا۔" عازم الدین نے ایک ٹھوس مسکراہٹ کے ساتھ کہا — "آج تم آرام کرو — کل میں تغلق آباد کے ان کھنڈروں کی طرف چلوں گا جہاں شہزادی زلیخا نے تم کو اپنی جھلک دکھائی تھی — یقین جانو سلیم — میں شہزادی کا ممنون ہوں کہ اس نے میرے اکلوتے بیٹے کی جان بچالی — میرے بوڑھے احساسات پر یہ احسان ہے اور میں تم سے حلفیہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کی بےچین و مضطرب روح کو اس احسان کا بدلہ ضرور ادا کروں گا۔"

"مجھے پوری بات بتائیے ڈیڈی — آپ نے ابتک ہر بات ادھوری کی ہے۔" سلیم نے بےچین ہو کر کہا۔

"تم صرف تین دن انتظار کر لو — میرے چند مخصوص احباب باہر سے آنے والے ہیں، ان کے آنے پر میں پوری کہانی بیان کر دوں گا" عازم الدین نے سلیم کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

الجھن کم کرنے کے بجائے باپ کی گفتگو نے سلیم کی الجھنیں بڑھا دیں — بار بار وہ شہزادی کی تصویر کی طرف دیکھتا رہا اور اس کا دماغ مسلسل

سوچتا رہا کہ مجھے گرفتار محبت کرنے سے شہزادی کا کیا مقصد تھا ۔۔؟"

لیکن سلیم کو اس سوال کا جواب نہ ملا ۔۔۔

دوسرے دن ناشتہ کی میز پر عازم الدین نے اپنے بیٹے کو تغلق آباد جانے کی تیاری کے لیے کہا اور اس کے علاوہ کوئی کوئی دوسری بات نہیں کی ۔۔۔ سلیم کو حیرت تھی کہ اس زبردست حادثہ کے باوجود اور یہ جاننے کے باوجود کہ ایک رُوح نے اس کے بیٹے کو سحر زدہ کر لیا ہے اس کے باپ کے چہرے پر کوئی الجھن اور کوئی بےچینی کیوں نہیں ہے، وہ اتنا پُرسکون کیوں نظر آ رہا ہے ۔۔۔

کیا وہ واقعی معاملہ کی تہ پر پہونچ چکا ہے ؟

ٹھیک دس بجے دونوں باپ بیٹے اپنی شاندار موٹر پر تغلق آباد کے کھنڈروں کی طرف روانہ ہو گئے ۔۔۔ نئی دہلی کی صاف ستھری سڑکیں گذرنے کے بعد عازم نے سلیم سے کہا ۔

" میں جانتا ہوں کہ روح کا کوئی مسکن نہیں ہوتا اس لیے تغلق آباد جانا بالکل بیکار ہے لیکن پھر بھی میں وہاں اس لیے جا رہا ہوں کہ شاید میں یہ معلوم کر سکوں کہ شہزادی نے تم پر اپنا غیر معمولی خوبصورتی کا جادو چلانے کے لیے تغلق آباد کے سنسان کھنڈروں کا ہی انتخاب کیوں کیا ۔۔۔؟ ہاں ایک بات اور ۔۔۔ کیا تم اپنی یادداشت پر زور دے کر یہ بتا سکتے ہو کہ وہ کیسا لباس پہنے ہوئے تھی ۔۔۔؟"

" وہی تصویر والا لباس ۔۔۔ بالکل سفید اور انتہائی باریک ۔۔۔"

سلیم نے جواب دیا اور اس کے بعد دونوں باپ بیٹے خاموش ہو گئے۔ شائد دونوں اپنے اپنے خیالات میں مستغرق تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ تغلق آباد کے سنسان اور غیر آباد علاقہ میں داخل ہو گئے۔ اور جب راستہ بالکل ہی ناہموار ہو گیا۔ تو عازم الدین نے موٹر روک دی۔ اب دونوں پیدل تھے۔ اور دُور سے تغلق آباد کے مہیب کھنڈر نظر آ رہے تھے۔

"ہم صحیح راستہ پر ہیں یا غلط راستہ پر۔؟" عازم نے سوال کیا۔

"مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری موٹر اسی سڑک پر جا رہی تھی۔"

"تو پھر ان کھنڈروں میں وہ بُرج تلاش کرو جس کے نیچے شہزادی کھڑی تھی"۔ اور دونوں سایہ دار گھنے درختوں میں بڑھتے گئے۔ ہر طرف تغلق آباد کے آثار کھنڈرات کی صورت میں موجود تھے۔ لیکن بُرج کا کوئی پتہ نہ تھا۔

دفعتاً سلیم رک گیا۔ "وہ دیکھئے۔ کچّی سڑک سے تقریباً چالیس گز کے فاصلہ پر وہ بُرج موجود ہے۔ اور وہ درخت بھی جس سے میری موٹر ٹکرا گئی تھی"۔ عازم بھی رک کر اس برج کو دیکھنے لگا۔ اور چند لمحات کے بعد دونوں اس برج کی طرف روانہ ہو گئے۔

سلیم کے ہر قدم کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی بڑھ جاتی تھی، ماحول واقعی دہشتناک تھا، ہر طرف خاموشی تھی اور ایسے خطرات تھے جن کا انسان کو تصوّر تک نہیں ہوتا لیکن عازم الدین بالکل پُرسکون انداز میں

اس طرح برج کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے وہاں کوئی شخص اس کی ملاقات کا منتظر ہو۔

نزدیک پہونچنے پر معلوم ہوا کہ برج ایک شکستہ مکان کی چھت پر بنا ہے، مکان کے چاروں طرف چہار دیواری کھنچی ہوئی ہے اور بائیں گوشے پر ایک چھوٹا سا مینار بھی بنا ہوا ہے۔ عازم الدین اور سلیم غور سے مکان کے گرد و پیش کا جائزہ لیتے رہے اور اس کے بعد عازم ایک شکستہ فصیل میں داخل ہو گیا۔

فصیل کے بعد ایک اچھا خاصہ میدان تھا جس میں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی، اور جنگلی پھولوں کی بے شمار جھاڑیاں موجود تھیں۔ میدان کے بعد ایک اور چہار دیواری تھی۔ جس میں ایک محراب دار دروازہ تھا اور سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

عازم نے غور سے ان پرانی، شکستہ اور پتھریلی سیڑھیوں کو دیکھا اور یہ دیکھ کر اسکی بھی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان سیڑھیوں پر باقاعدہ جھاڑو دی گئی ہے اور وہ بالکل صاف ہیں۔

"گویا اس سنسان مکان کے کھنڈر میں کوئی ذی حیات بھی موجود ہے" عازم الدین نے دل ہی دل میں کہا اور سلیم کو اشارہ کر کے زینے پر چڑھنے لگا، اور اس مکان میں داخل ہو کر جو یقیناً تغلق بادشاہوں کی رہائش کا کوئی اہم حصہ رہی ہو گی دونوں باپ بیٹوں کو ایک لمحہ کے لیے سناٹا سا ہو گیا۔

مکان بالکل خالی تھا۔ برج بالکل سنسان تھا۔ لیکن شکستہ مینار کے قریب ایک مسلمان بوڑھا درگاہ رب العزت میں سجدہ ریز تھا۔ حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دونوں اس بوڑھے نمازی کو دیکھتے رہے اور نماز کے بعد جب اس بوڑھے نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ان پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔

بوڑھے کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سُرخ تھیں، اور اُس کے سرخ و سفید چہرے پر جو روحانی جلال تھا اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔

"تم لوگ یہاں کیوں آئے۔ اور میری عبادت میں مخل کیوں ہوئے"

بوڑھے کی گرجدار آواز سے پوری فضا گونج گئی۔

"جی۔ ہم۔" عازم الدین سخت زل ہونے کے باوجود ہکلا گیا۔

"میرے لڑکے کو اس برج کے نزدیک ایک حادثہ ہو گیا تھا۔"

"وہ سب مجھے معلوم ہے۔ اور یہ میرا ہی حکم تھا۔ جو زلیخا کی روح نے تمھارے سلیم کو اسپتال تک پہونچا دیا۔" بوڑھے کی آواز میں اب بھی گرمی باقی تھی۔

اور بوڑھے کے اس جواب نے جیسے دونوں باپ بیٹے کے سوچنے سمجھنے اور جواب دینے کی صلاحیت ختم کر دی۔ وہ دم بخود رہ گئے۔ گتھی سلجھنے کے بجائے الجھتی ہی جا رہی تھی۔

"تو کیا یہ بوڑھا علم کی ان حدوں کو بھی پار کر چکا ہے جس کے بعد روح اور مادہ کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اور فانی و غیر فانی دونوں ایک ہی

وقت میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔" عازم الدین نے ایک منٹ کے لیے سوچا۔ اور چاہا کہ آگے بڑھ کر اس بوڑھے بزرگ کے ہاتھوں کا عقیدت بھرا بوسہ لے لے۔

"نہیں ۔" بوڑھے نے عازم الدین کو روک دیا ۔" میں اسے پرستش کہتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ عقیدت کا یہ مظاہرہ تم کیوں کر رہے ہو۔ سنو ۔ شہزادی زلیخا کی روح بھٹک رہی ہے، وہ بیداری کے لیے بیتاب ہے ۔ کفر و الحاد کے مجسمے فرعون نے اس کے زندہ جسم کی ممی بنا دی تھی ۔ حادثہ والی رات وہ مجھ سے ملنے آئی تھی ۔ کہ واپسی پر تمھارے لڑکے کی نگاہ اس پر پڑ گئی ۔ اور وہ حادثہ ہو گیا ۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا ۔"

"لیکن محترم بزرگ ۔ اب میں اپنے لڑکے کی خاطر اسے بیدار کرنا چاہتا ہوں" عازم الدین نے بوڑھے کے رعب و جلال کے باوجود کہہ ہی دیا ۔

"کوشش کر سکتے ہو ۔ قاہرہ سے آگے کسر[1] سے صرف ۲۲ میل کے فاصلہ پر اس کا زمین دوز مقبرہ موجود ہے ۔ جہاں وہ پتھر کے ایک تابوت میں گزشتہ ۲½ ہزار سال سے لیٹی ہوئی ہے ۔" بوڑھے کا لہجہ نرم ہو چکا تھا ۔ "اور اب تم جا سکتے ہو ۔ کوئی دوسرا سوال کیے بغیر ۔" اور یہ کہہ کر اس گمنام اور پراسرار بوڑھے عبادت گذار نے کچھ ایسی نظروں سے

---

[1] فراعنہ مصر کے مقبروں سے پہلے مصریوں کی ایک مختصر آبادی کا نام ہے۔

دونوں کی طرف دیکھا کہ دونوں پر ہیبت سی طاری ہو گئی اور دونوں اُلٹے قدم واپس آ گئے۔

عمارت کے باہر آ کر دونوں باپ بیٹے عالمِ سکوت میں ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئے اور اس پُر اسرار بوڑھے کی گفتگو اور اس کے نتائج پر غور کرتے رہے جس نے محض چند منٹ قبل ان کے حواسوں تک کو معطل کر دیا تھا۔ چند منٹ غور کرنے کے بعد عازم الدین جیسے چونک گیا۔ "آخری سوال تو ابھی باقی ہے۔ اس کے جواب کے بغیر زلیخا کا مقبرہ کیسے تلاش کیا جائیگا" اور وہ سلیم کی طرف کوئی اشارہ کئے بغیر انتہائی تیز قدموں کے ساتھ دوبارہ مکان میں داخل ہو گیا۔

لیکن اب مکان بالکل خالی تھا۔ علیم الدین نے اس کھنڈر کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن بوڑھے بزرگ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ مایوسی، ڈر اور خوف کے ملے جلے جذبہ کے ساتھ جب وہ واپس ہوا تو اسکی نظر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو ایک چھوٹے سے پتھر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے عازم نے کاغذ اُٹھایا تو اس میں لکھا تھا۔

"عازم الدین ۔۔۔ میری ملاقات کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔۔۔ اور نہ آج کے بعد مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔۔۔ یہ اسرار خود ہی ہیں ۔۔۔ تم ان کی تہ تک نہ پہونچ سکو گے مجھے معلوم تھا تم واپس ضرور آ ؤ گے اور مجھ سے شہزادی زلیخا کے مقبرہ کے بارے میں ایک آخری سوال ضرور کرو گے۔

تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ لکسر سے ۲۲ میل دور جب فراعنہ مصر کے کھنڈرات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تم شمال کی جانب بڑھتے جانا ــــ ½ ا میل کے بعد تمھیں ایک پہاڑی نما پتھریلا ٹیلہ ملے گا ــــ اس ٹیلہ پر چڑھو گے تو تمھیں مشرق کی جانب ایک چھوٹا سا مضبوط مقبرہ جو اہرام کی طرز پر بنا ہے دکھائی دے گا ــــ بس یہی زلیخا کا مقبرہ ہے ــــ اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کی باہری فصیل کے جنوبی پھاٹک پر قدیم مصری زبان میں یہ عبارت کندہ ہے ــــ

"اس کا مقبرہ ــــ جو بیدار کی جائے گی"

اپنے لڑکے سے کہہ دینا کہ وہ دیوانگی کی حدوں کو نہ چھوئے، زلیخا کی روح بھٹک رہی ہے اور اگر اس کو عملیات یا دیگر روحانی طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ انتہائی خطرناک حرکتوں کا بھی ارتکاب کر سکتی ہے ــــ

اس کا فرض ہے کہ وہ فی الحال زلیخا کو ایک خواب ہی سمجھے ــــ حالانکہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ زلیخا کی روح آج بھی دہلی میں موجود ہے اور شاید اسی جگہ ــــ تمہارے بالکل نزدیک ــــ جہاں تم یہ خط پڑھ رہے ہو"

عازم الدین نے گہری اور ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ خط ختم کیا ــــ اور یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ زلیخا اس کے

قریب موجود ہے'۔۔۔ تھرتھراتی ہوئی نظروں کے ساتھ اس نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا'۔۔۔ اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

برج کے نیچے زلیخا اپنے قدیم لباس میں موجود تھی، اس کے سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور وہ اپنی نیلی آنکھوں سے فصیل کے باہر سلیم کو دیکھ رہی تھی جو باپ کے انتظار میں بےچینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا'۔۔۔

چیخ کے ساتھ ہی زلیخا کی پرچھائیں غائب ہو گئی۔۔۔

کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ عازم الدین۔۔۔ جس نے زمانے کی سختی اور نرمی کا انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا تھا، وہ جو مصر کے اسرار کا دیوانہ تھا۔۔۔ اور جو قدیم مصر کی تہذیب کا حال معلوم کرنے کے لیے اپنی جان تک دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔۔۔ مکان سے باہر آیا۔۔۔ اور زینے پر کھڑے ہو کر ایک مرتبہ خالی برج پر اور دوسری مرتبہ فصیل کے باہر کھڑے ہوئے اپنے بیٹے سلیم پر نظر ڈالی'۔۔۔ اور جیسے باپ کی تمام محبت، تمام شفقت اور تمام جذبات اسکی آنکھوں میں امنڈ آئے'۔۔۔

بوڑھے خان بہادر نے وہیں کھڑے کھڑے ایک گہری سانس لی اور زیرلب فیصلہ کیا'۔۔۔

"سلیم کی خاطر مجھے شہزادی زلیخا کی بےچین روح کو سکون دینا

ہی پڑے گا۔ میں مصر جاکر اس کا مقبرہ ضرور کھودونگا۔ ورنہ زلیخا کی رُوح میرے بیٹے کو دیوانہ بنا دے گی۔"

لیکن سوال یہ تھا کہ تابوت میں سوتی ہوئی زلیخا کی زندہ ممی کو بیدار کیسے کیا جائے؟

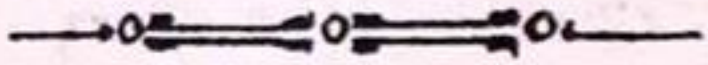

باب ـــــــــ ۴

خان بہادر عازم الدین ایسے مصر پرست کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ تغلق آباد کے کھنڈرات میں یہ واقعات پیش آئیں گے ـــــ اور اُن کی نہ صرف زلیخا سے بلکہ ایک ایسے انسان سے بھی ملاقات ہو گی جس پر انسان سے زیادہ فوق البشر اور فوق البشر سے زیادہ جن ہونیکا شبہ کیا جا سکتا ہے ـــــ

تقریباً تین بجے رات تک وہ سو نہ سکے ـــــ خیالات کا ہجوم اُن کو نیند سے دُور کرتا رہا، اور وہ زلیخا، بوڑھے عبادت گذار اور سلیم کی تثلیث میں اُلجھ کر رہ گئے ـــــ وہ جاگتے رہے اور عالم بیداری میں زلیخا کی زندہ لاش کو دیکھتے رہے اور باہر تمام رات بارش ہوتی رہی ـــــ بجلی چمکتی رہی اور بادل اتنی زور سے گرجتے رہے گویا ہزاروں

تو میں ایک ساتھ چلائی جا رہی ہوں۔ اور جب ان کو کوشش کے باوجود نیند نہ آئی تو وہ مسہری سے اٹھ کر آتش دان کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھ گئے۔ اور آگ کے شعلوں کو اس طرح دیکھتے رہے۔ گویا اس آگ کے شعلوں میں بھی ان کو زلیخا کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

اسی کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ سو گئے۔ اور جب صبح ان کی آنکھ کھلی تو بارش تھم چکی تھی، ابھرتے سورج کی کرنوں کا عکس پانی میں رنگ رنگ کے بلبلوں پر رقص کر رہا تھا۔ بھیگے ہوئے درخت تمام رات کی طوفانی بارش سے ڈرے سہمے کھڑے تھے اور دور سے ان کی بہن شمیم کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ اپنے کسی نوکر کو ڈانٹ رہی تھیں۔

ناشتہ سے قبل عازم الدین خلاف معمول اپنی لائبریری میں گئے اور دیر تک شہزادی زلیخا کی تصویر کو دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ یہ کہ اسی عالم میں ان کے ہونٹوں پر ایک ہیبتناک تبسم پیدا ہوا اور سگار منہ میں دبائے ناشتہ کی میز پر آ گئے۔ غالباً وہ کوئی فیصلہ کر چکے تھے۔

شمیم بانو میز پر اپنے بھائی اور سلیم کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن جب بھائی کے آ جانے کے بعد سلیم نہ آیا تو اس نے کہا "سلیم کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ آج بھی اس نے ناشتہ میں دیر کر دی۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھی کہ سلیم کمرہ میں داخل ہوا۔ اسکا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید تھا، آنکھوں میں شب بیداری کے اثرات تھے،

اور بالوں کی بے ترتیبی یہ گواہی دے رہی تھی کہ جیسے وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔ — بیٹے کی یہ حالت باپ سے چھپی نہ رہ سکی — اور انھوں نے پوچھا "کیوں سلیم — کیا تم رات دیر سے سوئے تھے۔"

"نہیں ڈیڈی —" سلیم کی آواز میں بھی مردنی تھی۔"

"کیوں — ؟"

"ڈیڈی — آپ یقین کریں یا نہ کریں بہرحال شہزادی زلیخا — [illegible] اس کوٹھی میں موجود رہی ہے۔"

"وہ کیسے ؟" — گھبراہٹ میں خان بہادر کے ہاتھ سے چمچہ گر گیا۔

"میں دس بجے رات کو ہی سو گیا تھا — لیکن تیز بارش کی آواز سے اچانک میری آنکھ کھل گئی، اور جب کافی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی تو میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی، سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور مجھے بارش سے دھلی ہوئی یہ ہوا اتنی اچھی لگی کہ میں وہیں کھڑکی کے نزدیک کھڑا ہو کر سڑک کی جانب دیکھنے لگا، جو بالکل سنسان تھی اور جس پر بارش کے باوجود ایک پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ —

ناگاہ میں نے دیکھا کہ ایک سایہ کوٹھی کا آہنی پھاٹک کھول کر داخل ہوا — پھاٹک کے نزدیک بالکل اندھیرا تھا لیکن جب یہ سایہ روشنی میں آیا تو وہ زلیخا تھی — جی ہاں زلیخا — جو غور سے میرے ہی کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ — وہی لباس، وہی نیلی آنکھیں، ویسے ہی سنہرے بال، اور گلے میں سونے کا ویسا ہی باریک سانپ — جو اس کی

تصویر میں موجود ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ ابتدا میں میں نے اس کو اپنا وہم سمجھا اور بحیثیت انسان ڈر کر اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر دی۔ چند منٹ تک حسب معمول بارش اور گھڑی کی ٹک ٹک کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں سنائی دی لیکن اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی اور نامعلوم سی دستک دی جا رہی ہے۔ قریب تھا کہ میرے منہ سے ایک جگر دوز چیخ نکل جاتی لیکن میں نے دل مضبوط کر کے دروازہ کھولا کہ شاید کوئی نوکر ہی کسی ہنگامی ضرورت کی وجہ سے دستک دے رہا ہو ـــ لیکن ڈیڑھی راہداری میں بالکل سناٹا تھا۔

ماتھے کا پسینہ پونچھ کر میں نے دروازہ بند کیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں دوبارہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ ابھی میرے خیالات میں یکسوئی آئی بھی نہ تھی کہ اچانک پھر دستک کی آواز سنائی دی ـــ ایک بار ـــ دو بار ـــ تیسری بار ہلکی بالکل ہلکی جیسے دستک دینے والے کے نازک ہاتھ تھکے جا رہے ہوں ـــ اس مرتبہ میں واقعی ڈر گیا ـــ میری ہمت جواب دے گئی۔ رات کے پر ہول سناٹے نے میرے خوف میں مزید اضافہ کیا۔ میں نے چاہا کہ میں چیخ مار کر آپ سب کو مدد کے لیے پکاروں لیکن آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی ـــ میں نے کوشش کی کہ اٹھ کر دروازہ کھولوں لیکن میرے قدم جم کر رہ گئے اور جیسے سارا بدن سن ہو گیا ـــ مجھے نہیں معلوم کہ میری نیم بیہوشی کی یہ کیفیت کتنی دیر تک باقی رہی ـــ

— لیکن جب میں نے اپنے حواس پر قابو پایا، تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا — اور میرے سرہانے نیلے گلاب کا ایک پھول رکھا ہوا تھا — بالکل ویسا ہی پھول جیسا شہزادی زلیخا کی تصویر میں موجود ہے —

میں نے یہ پھول اپنے کانپتے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھانا چاہا لیکن اٹھا نہ سکا — رات اسی طرح گزر گئی — اور تمام رات میں ایسا محسوس کرتا رہا جیسے کوٹھی کے باغیچے میں کوئی وجود اپنے نرم پیروں کے ساتھ چہل قدمی کر رہا ہے —"

سلیم نے یہ کہکر اپنی بند مٹھی کھولی — گلاب کا نیلا پھول اب بھی بالکل تر و تازہ تھا —

خان بہادر عازم الدین نے غور سے اس پھول کو دیکھا اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری — اور دوبارہ ناشتہ میں مصروف ہو گئے —

شمیم بانو جو غور سے بھتیجے کی آپ بیتی سن رہی تھی ناشتہ کی طرف قطعی متوجہ نہیں ہوئی — اور اس نے کہا "میرے خیال میں سلیم پر کسی آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے"

عازم الدین نے بہن کی اس خلوص میں ڈوبی ہوئی بے معنی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور ناشتہ کر رہے — گویا ان کے خیال میں سلیم کی یہ سرگذشت متوقع تھی اور انھیں اس کا پہلے سے علم تھا —

"آج رات تم میرے کمرے میں سونا — زلیخا کے سلسلے میں کل رات

میں نے بھی ایک اہم فیصلہ کیا ہے اور کل صبح آقا مصدق طہرانی کی آمد کے بعد میں اپنا کام شروع کر دوں گا۔"

"کیا کام ۔" سلیم نے بےچین ہو کر پوچھا۔

"زلیخا کی بیداری کا کام ۔۔۔ میں اسے بیدار کر کے رہوں گا ۔۔۔"

عازم الدین نے مضبوط قوت ارادی کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ زلیخا کون ہے ۔۔۔ آپ کس کی بیداری کا تذکرہ کر رہے ہیں ۔" شمیم بانو نے بھائی سے سوال کیا ۔۔۔ اور بھائی نے کہا ۔۔۔ "ایک شہزادی ۔۔۔ جو سو رہی ہے ۔۔۔ اور یہ میرا حکم ہے کہ آج کے بعد اس مسئلہ پر تم مجھ سے کوئی بات نہ کرنا"

بھائی کا حکم سن کر شمیم خاموش ہو گئی، عازم الدین ناشتہ سے فارغ ہو کر چلے بھی گئے، لیکن سلیم اس طرح کرسی پر بیٹھا رہا جیسے وہ بے انتہا تھک گیا ہو،

باب ـــــــــ ۵

دوسرا دن اور دوسری رات خیریت سے گذری ـــ سوائے اس کے کہ سلیم کے بیچین دل کو کسی طرح قرار نہ آیا ـــ اور جب صبح آئی تو یہ صبح آقا مصدق طہرانی کی صبح تھی جو عازم الدین کے بحری تار پر بذریعہ ہوائی جہاز صبح آٹھ بجے دہلی پہونچ رہے تھے ـــ

عازم الدین اور سلیم دونوں وقت سے بیس منٹ پہلے ہوائی اڈے پہونچ گئے ٹھیک آٹھ بجے جہاز پالم کے ہوائی اڈے پر اترا ـــ اور تمام مسافر جہاز سے باہر آئے تو خان بہادر کو دور ہی سے مصدق طہرانی کا چہرہ دکھائی دینے لگا کیونکہ طہرانی کا قد کسی حال میں ۶½ فٹ سے کم نہ تھا، ان کے حد و خال کافی دلاویز تھے، چمکدار بھورے بالوں میں نہایت خوش اسلوبی سے کنگھی کی ہوئی تھی، چہرے پر مختصر سی مونچھیں تھیں اور خفیف سی

ڈاڑھی تھی، ـــــ اور جسم پر ایرانیوں کا قومی لباس تھا،

طہرانی نے بھی عازم الدین کو دیکھتے ہی اپنا ہاتھ اٹھا کر خسروانہ انداز میں سلام کیا، ـــــ اور عازم الدین کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ پھیل گئی، ـــــ

کسٹم سے فارغ ہو کر جب طہرانی نے اصل عمارت میں قدم رکھا تو عازم نے دوڑ کر اس سے مصافحہ کیا اور بغل گیر ہو کر اپنے لڑکے سلیم سے اسکا تعارف کرا دیا، طہرانی نے پر خلوص دعاؤں کے ساتھ سلیم کے سر پر ہاتھ پھیرا ـــــ اور ایک مرتبہ پھر خان بہادر سے خیریت دریافت کی، ـــــ

"آپ کا تفصیلی بحری تار پڑھ کر میں گھبرا سا گیا اور گو مجھے بالکل فرصت نہ تھی لیکن پھر بھی میں نے اپنا فرض سمجھا کہ جلد از جلد آپ کی مطلوبہ چیزوں کے ساتھ اپنے دوست کی مدد کے لیے دہلی پہونچ جاؤں" طہرانی نے عازم الدین سے مخاطب ہو کر کہا اور سلیم یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی آواز میں موسیقی کی سی ملاحت ہے، ـــــ

"آقائے طہرانی ـــــ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں ـــــ بہر حال آپ کوٹھی چلیے ـــــ دوپہر کے کھانے کے بعد اطمینان سے باتیں ہونگی" ـــــ خان بہادر عازم الدین نے گرمجوشی سے طہرانی کا ہاتھ پکڑ کر کہا ـــــ اور پھر تینوں آدمی موٹر میں بیٹھ گئے، ـــــ

آقا مصدق طہرانی پیدائشی طور پر ایرانی تھے لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ مصر میں گذرا تھا ـــــ قدیم مصر کے اسرار معلوم کرنا ہی ان کی زندگی کا

مقصد تھا۔ مصر کی قدیم زبانوں پر ان کو عبور حاصل تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر یورپ اور امریکہ بلائے جاتے تھے کہ وہ مصری مقبروں کی کھدائی میں نکلے ہوئے سنگی کتبوں کو پڑھ دیں۔ آثار مصر پر حکومت مصر کی اجازت کے بعد قدیم مقبروں کی کھدائی اکثر خود بھی کرواتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے اکثر عجائب خانوں میں انھیں کے فرد خت کردہ مصری نوادر موجود تھے۔ خان بہادر عازم الدین کی کوٹھی بھی انھیں کی بیچی ہوئی مصری چیزوں سے سجی ہوئی تھی، اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عازم الدین کی کوٹھی مصری طرز تعمیر کی بنیادوں پر بنائی گئی اور اس کو اس انداز سے سجایا گیا کہ کوٹھی کے ہر گوشے سے قدیم مصر کی تاریخ و تہذیب کی بو آنے لگی۔

کوٹھی کی لائبریری میں شہزادی زلیخا کی جو تصویر موجود تھی وہ ایک مصوّر نے اس تصویر کو سامنے رکھ کر بنائی تھی جو آغا طہرانی کو چند پرانی دستاویزوں کے ساتھ مصر میں ایک قدیم مقبرہ کی کھدائی کے وقت ملی تھیں۔ اور خان بہادر عازم الدین نے اس اصلی تصویر اور تمام دستاویزوں کا از سر نو مطالعہ کرنے اور اپنے اگلے پروگرام میں طہرانی کی ہر ممکن امداد حاصل کرنے کے لیے مصدق کو طہران سے بلایا تھا۔ جہاں وہ عمر کے آخری ایام سکون سے بسر کر رہے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد عازم الدین سلیم اور طہرانی گفتگو کرنے کے لیے اس کمرہ میں بیٹھ گئے جس میں طہرانی کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور عازم الدین نے شروع سے اب تک کے تمام واقعات طہرانی کو سنا دیے

"زلیخا کی روح واقعی بھٹک رہی ہے ۔۔۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کے اشتراک و تعاون سے اسکی روح کو سکون دے دوں" عازم الدین نے تمام واقعات سنانے کے بعد امید بھرے لہجہ میں کہا۔

"میرے ہندی دوست ۔۔۔ بڑھاپے نے ایک بڑی حد تک مجھے مضمحل کر دیا ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ عمر کے اس آخری دور میں کوئی سخت کام کروں لیکن اس حادثہ کی تفصیل نے خود میرا سویا ہوا شوق بیدار کر دیا ہے ۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مہم میں آپ کو میرا ہر ممکن تعاون حاصل ہو گا ۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ رعمیس[1] نہم کے زمانے سے اب تک زندہ انسانوں کا مقبرہ بنانے کی تجویز کسی بنی نوع انسان کے لیے نہیں بنائی گئی ہو گی" طہرانی نے ٹھہر ٹھہر کر کہا ۔۔۔ اور پھر اپنا وہ چرمی سوٹ کیس کھولا جس کو وہ ہوائی جہاز سے اترتے وقت اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے، اور جس میں مصری ساخت کے چھوٹے چھوٹے قفل لگے ہوئے تھے۔

چرمی سوٹ کیس کو انتہائی احتیاط سے کھولنے کے بعد انھوں نے ایک داغدار بوسیدہ تین فٹ لمبا چمڑہ جس کا ایک حصہ غائب تھا نکالا اور قریب کی میز پر پھیلا دیا۔ "بس یہی وہ آخری دستاویز ہے ۔۔۔ جو زلیخا کی گمشدہ زندگی پر روشنی ڈال سکتی ہے" طہرانی نے یہ کہتے ہوئے دستاویز پر بنی ہوئی ایک تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور سلیم نے دیکھا کہ ۔۔۔ لائبریری والی تصویر ۔۔۔ اس تصویر کی ایک صاف ستھری نقل ہے

---

[1] رعمیس نہم ایک مشہور فرعون گذرا ہے ۔۔۔

— اس کی نگاہیں اس ہزاروں سال پرانی تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ — اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تصویر سے جھانکنے والی شہزادی زلیخا کی آنکھیں ایک ساحرہ کی لوح کی طرح اس کو اپنے سحر سے ساکت کر لی جا رہی ہیں —

"بلاشبہ یہ تصویر قدیم مصری اہل فن کی مصوری کا انوکھا شاہکار ہے — اور اس دستاویز میں جو بہر حال ناممکن ہے تفصیل کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ زندہ شہزادی زلیخا کی تجہیز و تکفین کیسے کی گئی" طہرانی نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ کہا "اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج میں اس دستاویز کا مالک ہوں۔ جو مجھے آج سے تقریباً ۲۷ سال قبل ایک مقبرہ کے کھنڈروں کی کھدائی کے وقت ایک آہنی صندوق میں موم جامہ کئے ہوئے ملی تھی — موم جامہ کھولتے ہی میں نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ کوئی عام وصیت نامہ نہیں ہے جو عموماً ممی کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا چنانچہ میں نے دستاویز کے ان حصوں کو دواؤں کی مدد سے صاف کیا جو خراب ہو گئے تھے — اور جب میں نے دستاویز پر لکھی ہوئی پوری کہانی پڑھ لی تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ دستاویز نہ صرف لاثانی بلکہ انمول ہے — کیونکہ اس پر سیتی اول[1] کی حکومت کے آخری ایام کی تاریخ اور اس کی مہر ثبت تھی جس کی مصر میں ۱۳۶۰ء قبل مسیح حکومت تھی یعنی اس طرح یہ دستاویز تقریباً تین ہزار دو سو سال پرانی ہو چکی تھی —

سیتی اول کے دور حکومت میں ممی بنانے کا فن اپنے عروج پر پہنچ

---

[1] سیتی اول بھی مصر کا ایک فرعون تھا۔ جس نے بڑی شان و شوکت سے حکومت کی تھی۔

چکا تھا، ممی بنانے کے سلسلہ میں حکماء اور فن کار روز نئے نئے تجربے کرتے تھے اور فرعون ان کی سرپرستی کر کے ان کو انعام و اکرام دیتا رہتا تھا۔۔۔ اس دستاویز میں یہ درج ہے کہ ممی بنانے کے فن کو ماہرین کے ایک گروہ نے جو خاص طور سے سیتی اول کے حکم سے متعین کیا گیا تھا سالہا سال کے مطالعہ اور تجربوں کے بعد ایک ایسی منزل پر پہونچا دیا جو نتیجہ معلوم کیے بغیر ادھوری ہی کہی جا سکتی تھی۔۔۔ ان ماہرین کا مقصد تھا کہ وہ ایک زندہ انسان کی ممی بنائیں اور پھر اسے ایک مقررہ مدت تک زندہ بھی رکھیں۔۔۔"

دونوں باپ بیٹے طہرانی کی گفتگو میں منہمک رہے اور طہرانی کہتا رہا "یہ دستاویز دو حصّوں پر مشتمل ہے، پہلا حصّہ مکمل ہے اور دوسرا نامکمل کیونکہ اسکا ایک حصہ غائب ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا حصّہ اس میں شامل نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہاں سے اس نے اپنی لمبی انگلی دستاویز پر رکھی "اس پھٹے ہوئے حصہ تک تقریباً تین سو برس کی داستان ضرور ختم ہو گئی جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر سات فرعونوں کے کاتبوں کے نام یا دستخط درج ہیں۔۔۔"

اگر میرا علم صحیح ہے اور میں نے اس کو غلط نہیں پڑھا ہے تو میرے خیال میں اس دستاویز کا پہلا مختصر حصہ سیتی اول کے اختتام سلطنت کے آخری ایّام میں لکھا گیا ہے اور اس میں یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ فرعون دوران سیتی اول کی نشاء حاصل کر کے بجیز و تکفین کے دیوتا "ایمون راع" کے ایک کاہن اعظم کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی کہ نہ صرف انسانی جسم بلکہ اسکی روح بھی مخصوص حالات میں ایک لامحدود عرصہ تک اپنی اصلی حالت میں باقی رکھی جاسکتی ہے۔"

"ایمون راع" کے اس کاہن اعظم کو یقین تھا کہ اس نے ہر وہ انتظام کر لیا ہے جو روح انسانی کی بقاء کے اس تجربہ کو کامیاب بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے۔ چنانچہ اس نے اپنے اس فلسفہ کو کامیاب بنانے کے لیے فرعون کی سرپرستی حاصل کرنا چاہی اور وہ یہ شاہانہ سرپرستی حاصل کرنے میں فتحیاب بھی ہو گیا۔

تجربہ میں فرعون کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔

تراشے ہوئے خوبصورت بُت، عالیشان مقبرے، اور لافانی اہرام سیٹی اول کی سطوت و شوکت کے اظہار کے لیے ناکافی خیال کیے گئے، اسلئے یہ طے پایا کہ آنے والی نسلوں اور مستقبل کی دنیا کے سامنے مصر اور فرعون مصر کی عظمت پارینہ کی تصدیق کرنے کے لیے ایک زندہ یادگار قائم ہونا چاہیے، ـــــ اور اس باعزت اور باعث افتخار یادگار کے لیے شہزادی زلیخا نے جو تناسب اعضاء نیلی آنکھوں اور رنگ و روپ کے اعتبار سے اپنے دور کی سب سے خوبصورت شہزادی تھی خود کو پیش کر دیا۔

دستاویز کے پہلے حصہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ شہزادی زلیخا کو مصر کے ایک دور افتادہ علاقے "یونا" کے ایک شہزادے سے جس کا نام "احمس" تھا شدید محبت تھی، احمس اپنے دور کا ایک بہادر جنگجو افسر بھی تھا اور خود بھی زلیخا پر ملتفت تھا لیکن دیوتاؤں کو شاید محبت کا یہ رشتہ پسند نہیں آیا اور

شہزادی زلیخا کی مرضی کے بالکل خلاف اسکی منگنی "اسپاتا" نام کے ایک بزدل اور عیاش شہزادے سے کر دی گئی۔ جبکہ زلیخا کو موت منظور تھی لیکن کسی حال میں یہ پسند نہ تھا کہ اس کے دل کی دنیا میں احمس کے علاوہ کوئی اور اپنی دنیا آباد کرے۔

اسی اثنا میں "احمس" شمالی جنگوں میں مارا گیا اور زلیخا کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ احمس کی موت کے بعد زلیخا کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ ہر رات کو سفید لباس پہن کر ایک ایسی فٹن میں سوار ہو کر جس میں کالے گھوڑے جتے ہوتے تھے احمس کے مقبرہ جاتی اور اس کے دروازے پر نیلے گلاب کا ایک پھول جو اس کو بیحد پسند تھا رکھ کر روتی ہوئی واپس آجاتی۔ وہ اپنی اس نامراد زندگی سے عاجز ہو کر ہر لمحہ موت کی دعا مانگتی تھی اور اس نے ایک دن سیٹی اول کے سامنے دو زانو ہو کر "اسپاتا" سے شادی کرنے سے انکار بھی کر دیا۔

قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ اگر جسم باقی رہتا ہے تو مرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی دن روح دوبارہ اپنے جسم میں داخل ہو گی اور مردہ ایک مرتبہ پھر زندہ ہو جائیگا بد نصیب زلیخا کو بھی اس عقیدہ پر یقین تھا چنانچہ جب اس نے سنا کہ "ایمون راع" کے کاہن اعظم کو اپنے اس تجربہ کے لیے ایک زندہ انسان کی ممی بنائے جانے اور اسکی روح کو ایک لامحدود عرصہ تک باقی رکھا جائے ایک انسانی جسم کی ضرورت ہے تو اس نے اس تجربہ کے لیے اپنے جسم کی خدمات پیش کر دی۔ تاکہ اگر تجربہ کامیاب ہو تو اس وقت تک اس کی

اسکی روح اور اس کا جسم اپنی تمام تر تازگی، شگفتگی اور جوانی کے ساتھ باقی رہے جب تک کہ دیوتاؤں کے حکم سے "احمس" کی روح دوبارہ اپنے جسم میں داخل نہ ہو جائے"۔۔۔۔

شہزادی زلیخا کو یقین تھا کہ اپنے زندہ جسم کے ساتھ ہزاروں سال کی گہری اور پُرسکون نیند کے بعد جب وہ بیدار ہو گی تو اس کی ملاقات اپنے محبوب سے ضرور ہو گی"۔۔۔۔

چند منٹ کے سکوت کے بعد طہرانی نے دوبارہ اپنا سلسلۂ کلام جاری کیا "اس دستاویز میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ شہزادی زلیخا کے زندہ جسم کی ممی کس طرح بنائی گئی اور ضرورت کے وقت اس کو کس طرح بیدار کیا جائے گا۔۔۔۔ لیکن اس میں یہ ضرور لکھا ہے کہ جب فرعون نے زلیخا کی پیش کش قبول کر لی تو اس کے لیے نیل کے کنارے ایک خاص قسم کا زمین دوز مقبرہ بنایا گیا اور پھر کاہن اعظم کی نگرانی میں اس کو ایک سنگی تابوت میں پرسکون، گہری اور مسلسل نیند میں سُلا دیا گیا۔۔۔۔

اور اس طرح سیتی اول کے دورِ حکومت میں اپنی نوعیت کے ایک انوکھے تجربے کا آغاز ہو گیا۔۔۔۔ بظاہر یہ ایک بھیانک خواب معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ طاقت اور جھوٹی خدائی کے نشہ میں چور ایک دیوانے فرعون کا خواب۔ جس نے ایک بیکس دوشیزہ کی زندگی ایک مسلسل نیند میں تبدیل کر دی۔۔۔۔ لیکن دستاویز کا دوسرا حصہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سیتی اور دیوتا ایمون راع کاہن اعظم نے جو خواب دیکھا تھا اسکی تعبیر بعد کے فرعون دیکھتے رہے۔۔۔۔ یعنی

زلیخا زندہ رہی اور بند آنکھوں کے ساتھ زندگی کی بھرپور سانسیں لیتی رہی"۔

دستاویز کے دوسرے نامکمل حصے میں جو حالات درج ہیں ان کے بموجب ہر فرعون وقت مقررہ پر زلیخا کا مقبرہ کھول کر اس کام کے لیے متعین کاہنوں کی موجودگی میں خوابیدہ زلیخا کو جگا کر اسکی موت و حیات کا امتحان لیتا تھا اور دستاویز پر تجربہ کی کامیابی کی مہر لگا کر دوبارہ مقبرہ بند کر دیتا تھا۔ سیتی اول کی وصیت کے بموجب ہر پچاس برس کے بعد یہ امتحان ضروری تھا، چنانچہ دستاویز بتاتی ہے کہ مقبرہ کا دروازہ سات مرتبہ کھولا گیا اور اس کے ثبوت میں اس پر سات فرعونوں کی دستخط موجود ہیں۔

سیتی اول نے زلیخا کے سنگی تابوت کے قریب وہ تمام دوائیں رکھدی تھیں جن سے زلیخا کو بیدار کیا جا سکتا تھا اور ایک چکنے پتھر پر جگانے کا طریق کار کندہ کرا دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک سات فرعون اس پر عمل کر کے زلیخا کی ناقابل یقین نیند سے بیداری اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور دستاویز پر نتیجہ کا اندراج کرتے رہے۔ یہ اندراج اسی رنگ سے کیا جاتا تھا جو اس فرعون کا قومی اور سرکاری رنگ[1] ہوتا تھا چنانچہ دستاویز میں واقعی سات رنگ موجود ہیں۔ فرعون کے علاوہ کاہن اعظم بھی تصدیق کے لیے

---

[1] قدیم مصری تاریخ بتاتی ہے کہ ہر فرعون اپنے دور حکومت کا ایک سرکاری رنگ مقرر کرتا تھا، فوج کی وردی اسی رنگ کی ہوتی تھی، شاہی خاندان کا بالائی لباس اسی رنگ کا ہوتا تھا اور اسی رنگ کی روشنائی سے لکھا جاتا تھا۔

دستخط کرتا تھا اور ایک الگ حاشیہ پر اپنے تاثرات بیان کر دیتا تھا ـــــ دستاویز کی صداقت کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ ہر کاہن اعظم کا خط ایک دوسرے سے مختلف ہے ـــــ

مجھے نہیں معلوم کہ دستاویز کا جو حصہ ضائع ہو چکا ہے اس میں کیا تحریر تھا اور بعد کے کیا واقعات بیان کئے گئے تھے لیکن ساتویں فرعون نے خود اس میں اپنے ہاتھوں سے مہر لگانے کے بعد یہ لکھا ہے کہ "تا دم تحریر شہزادی زلیخا زندہ ہے ـــــ"

طہرانی نے مزید کہا ـــــ آج سے ۲۷ سال قبل جب میں مصر میں تھا اور آج بھی جبکہ میں مصر اور اس کے اسرار سے سینکڑوں میل دور ہوں مجھے یقین تھا اور ہے کہ یہ دستاویز اور اس میں بیان کردہ تفصیل موجودہ دنیا کی حکمت، سرجری، اور سائنس کو باطل ثابت کر سکتی ہے بشرطیکہ زلیخا کا مقبرہ دریافت کر لیا جائے ـــــ میں ہمیشہ سے قدیم مصری تہذیب کا دیوانہ تھا چنانچہ میں مصر کے اس اسرار کا پرچم ساری دنیا پر لہرانے کے لیے زلیخا کا مقبرہ تلاش کرتا رہا ـــــ اور مسلسل پانچ سال تک وادیٔ نیل میں گھومتا رہا کہ شاید مجھے یہ مقبرہ مل جائے اور میں سیٹی اول کی ہدایت پر عمل کر کے اس زلیخا کو نیند سے بیدار کر دوں جو تقریباً ۳½ ہزار سال سے اپنے تابوت میں سو رہی ہے اور اس کی منتظر ہے کہ وہ جاگے اور جاگ کر اپنے محبوب احمس سے ملاقات کرے ـــــ لیکن اپنی ہر کوشش کے باوجود میں مقبرہ کی تلاش میں ناکام رہا ـــــ

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے پورا یقین ہے کہ شہزادی زلیخا کا زندہ جسم آج بھی اپنے زمین دوز مقبرہ کے سنگی تابوت میں سو رہا ہے۔ لیکن اب شاید حرمان نصیب شہزادی کی روح اپنے جسم کی بیداری کے لیے بے چین ہو گئی ہے ۔۔۔ شاید اس لیے کہ اسکی بھٹکی ہوئی روح نے اپنی محبت کے مرکز "احمس" کو دنیا کے کسی گوشے میں کسی اور نام یا کسی اور قالب میں دیکھ لیا ہو ۔۔۔ اور وہ اپنے محبوب سے اس ملاقات کے لیے جس کی خاطر اس نے ایک خطرناک تجربہ کے لیے اپنے جسم کی پیش کش کی تھی بے چین ہو گئی ہو ۔۔۔ شہزادی کی روح جانتی ہے کہ جسم کے بغیر روح بیکار ہے اور شاید اسی لیے اسکی روح کو اپنے اس زندہ جسم کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو ۔۔۔ جو اپنے تابوت میں سو رہا ہے ۔۔۔

شدت جذبات سے طہرانی کی آواز بھرا گئی ۔۔۔ وہ چند منٹ تک بالکل خاموش رہا اور اپنی نم آنکھوں سے اس دستاویز کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس دستاویز کو اسی طرح طے کر کے چرمی سوٹ کیس میں رکھا اور کہا ۔۔۔ "دوست عازم الدین ۔۔۔ تمھارے دل پر کچھ بھی بیتے اور تمھیں کتنا ہی صدمہ کیوں نہ ہو ۔۔۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ زلیخا کا محبوب شہزادہ احمس ۔۔۔ تمھارا بیٹا سلیم ہی ہے ۔۔۔ ورنہ زلیخا کی روح دلی کو اپنا مرکز نہ بناتی ۔۔۔ رات کی تاریکی میں اس کی روح تمھاری کوٹھی کے مختلف کمروں میں نہ بھٹکتی اور سلیم کی خواب گاہ میں داخل ہو کر نیم بیہوش سلیم کے سرہانے نیلے گلاب کا پھول نہ رکھتی ۔۔۔

میں نہیں جانتا کہ تمھارے بیان کے بموجب تغلق آباد کے کھنڈروں میں تم سے ملاقات کرنے والا وہ بزرگ کون تھا ـــــ لیکن زلیخا کے بارے میں اس کے انکشافات اور پھر تمھارے نام اس کے خط میں زلیخا کے مقبرہ کا مکمل پتہ یہ ضرور ثابت کرتا ہے کہ وہ فوق البشر ضرور تھا ـــــ اور وہ خود چاہتا ہے کہ زلیخا کو مسلسل نیند کی قید سے نجات مل جائے ـــــ

"اس لیے آؤ میرے دوست ـــــ ہم دونوں مل کر زلیخا کا مقبرہ تلاش کریں اس کو اس کی نیند سے بیدار کریں اور ایک عورت کو اس کے محبوب سے ملا دیں ـــــ"

عازم الدین اور سلیم دونوں پر سکتہ طاری تھا، طہرانی کی اس لمبی گفتگو اور جذباتی خواہش کے اظہار کے بعد بھی دونوں کئی منٹ تک خاموش رہے ـــــ ایک مرتبہ پھر عازم الدین کے چہرے پر شاداب مسکراہٹ پھیلی اور اس نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے طہرانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا ـــــ

"میرے ایرانی دوست ـــــ میں خود زلیخا کے مقبرہ کی تلاش میں تمھاری مدد چاہتا تھا اور اسی لیے سابقہ تعلقات کے پیش نظر میں نے تمھیں تار بھیجکر یہاں بلوا لیا ـــــ لیکن سلیم کے قالب میں زلیخا کے محبوب شہزادے احمس کی روح موجود ہے یہ میں ماننے کے لیے تیار نہیں ـــــ اس لیے کہ میں آواگون کا قائل ہی نہیں ـــــ"

"میں مہم کی افادیت اور اس کے مقاصد کے پیش نظر تم سے مسئلہ تناسخ پر کوئی بحث کرنا بھی نہیں چاہتا ـــــ کیونکہ میں خود اس کا قائل نہیں ہوں

لیکن تم دیکھ لینا کہ اگر ہمیں زلیخا کا تابوت مل گیا اور ہم اس کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سلیم ہی احمس ثابت ہو گا۔" طہرانی نے پورے یقین کے ساتھ کہا "خیر" طہرانی نے کچھ توقف کے بعد عازم الدین سے کہا "تمھارا آخری فیصلہ کیا ہے؟"

"ہم تینوں آدمی اردن اسپتال کے ڈاکٹر بیگ کے ہمراہ اگلے ہفتہ مصر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ آج سے زلیخا کے تابوت کی تلاش ہی میرا مقصد حیات ہے۔"

اور عازم الدین کے اس جملہ نے جیسے کمرے کی پرسکون فضا ہی بدل دی

باب ـــــــــ ۶

تین دن تک کوٹھی میں کوئی قابل ذکر حادثہ نہیں ہوا۔ عازم الدین سرگرمی سے مصر کے سفر کی تیاریوں میں مصروف رہے، اور انھوں نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد ڈاکٹر بیگ کو بھی سفر میں شریک ہونے کے لیے رضامند کر لیا۔ ڈاکٹر بیگ کا کہنا تھا کہ زلیخا اور اسکی روح کا قصہ ایک جھوٹی اور بے بنیاد کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا وہ سفر میں جانے کے لیے بالکل تیار نہ تھے لیکن عازم الدین کی ضد کے آگے آخر کار انھیں سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا، اور انھوں نے بھی تین ماہ کی چھٹی لیکر سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

دھیرے دھیرے عازم الدین کے حلقۂ احباب میں یہ خبر پھیل گئی کہ وہ کسی اہم مہم پر مصر جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں، چنانچہ ایک دن ان کے

دو دوست جن میں ایک فلسفہ اور ریاضی کا پروفیسر ارشد تھا اور دوسرا علم کیمیا و ہیئت کا ماہر احمد ریاض تھا دن سے الوداعی ملاقات کرنے کے لیے کوٹھی آئے ـــــ جہاں عازم الدین نے ان کا تعارف اپنے ایرانی دوست طہرانی سے بھی کرایا ـــــ . اور اس طرح ڈاکٹر بیگ کی موجودگی میں سفر کی نوعیت پر ایک دلچسپ گفتگو شروع ہو گئی ـــــ

"کیا آپ کو بالکل یقین ہے کہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو گی اور آپ زلیخا کا زندہ جسم حاصل کر کے اس کو بیدار کر لیں گے" پروفیسر ارشد نے سگار کا دھواں منہ سے چھوڑتے ہوئے کہا ـــــ

"ہاں ـــــ مجھے پورا یقین ہے ـــــ" عازم الدین کے بجائے مصدق طہرانی نے جواب دیا۔

"لیکن مجھے نہیں ہے ـــــ" پروفیسر ارشد نے گردن ہلا کر کہا۔

"یقین نہ ہونے کا سبب" ـــــ . عازم الدین نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں اس کہانی کو ہی جھوٹا سمجھتا ہوں ـــــ" پروفیسر ارشد نے منہ بنا کر کہا اور ـــــ پروفیسر کے اس روکھے جواب پر کمرہ کی فضاء مکدّر کر دی ـــــ

پروفیسر عام حالات میں بھی بیحد خشک مزاج اور آہستہ گو تھا، وہ صرف ان مسائل پر گفتگو کرنے میں جوش دکھاتا تھا جس میں خود اس کو دلچسپی ہو اور اسی لیے اس کے احباب اس کی باتوں کا برا نہیں مانتے تھے ـــــ لیکن طہرانی ـــــ وہ اس کے دوستوں میں تو نہ تھا؟

احمد ریاض ایک دراز قامت، دبیہ اور خوش گفتار بوڑھا تھا جسمیں خداداد صلاحیتیں موجود تھیں، جسمانی اعتبار سے وہ گول مول قسم کا انسان تھا، جس کا چہرہ سرخ، سر ضرورت سے زیادہ بڑا اور بال بالکل بھورے تھے۔

اور ان سب کے برعکس طہرانی کی خوش مزاجی یا بدمزاجی کا دیکھنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ اس محفل میں وہ سب سے زیادہ دانا اور سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، دنیا کے مہذب یا غیر مہذب بہت کم ایسے ملک ہوں گے جہاں کی سیاحت اس نے نہ کی ہو۔ حد یہ کہ وہ ایمیزن کے جنگلات بھی دیکھ چکا تھا اور تبت کے پُراسرار دیہات بھی۔ اس کو پروفیسر ارشد کا یہ جواب برا تو بہت لگا لیکن پھر بھی مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

ادھر عازم الدین اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے مجوزہ سفر کی تفصیل اور اس کی نوعیت پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے اور ادھر سلیم اپنی بیچینیوں کو دل کی گہرائیوں میں دبائے کوٹھی کی چھت پر بلا مقصد ٹہل رہا تھا۔

جاوید کی کوٹھی جس کا نام خان بہادر عازم الدین نے اپنے شوق کی عکاسی کرنے کے لیے "عروس نیل" رکھا تھا کشمیری دروازے کے باہر ایک کھلی ہوئی جگہ پر تھی اور وہ اس وقت عمارت کی سب سے اونچی چھت پر تھا جہاں سے پوری آبادی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سکون میں ڈوبی ہوئی آبادی کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ چھت پر کھڑے ہی کھڑے اس نے باغ کے اس گوشے پر نگاہ ڈالی جہاں ایک رات زلیخا اسے دکھائی دی تھی۔ لیکن

اس وقت اسے خار دار انگور کی بیلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔ چنانچہ جب یہاں بھی اسے کوئی سکون نہ ملا تو وہ لائبریری چلا گیا کہ کچھ دیر شہزادی کی تصویر ہی دیکھ کر اپنا دل بہلائے ۔۔۔ دیر تک وہ اس خاموش، ساکت اور پُر اسرار تصویر کو دیکھتا رہا ۔۔۔ اس تصویر میں بنی ہوئی سمندر سے زیادہ گہری نیلی آنکھوں میں جھانکتا رہا ۔۔۔ اور ان سنہرے بالوں کو دیکھتا رہا جو اس کے دل کی دھڑکنوں کے چاروں طرف ایک حصار سا کھینچ چکے تھے ۔۔۔

اور جب اس کا دل یہاں بھی نہیں لگا تو وہ اس کمرے میں چلا آیا جہاں اس کے والد کے پانچوں قریبی دوست مصر کے سفر پر ایک تلخ گفتگو کر رہے تھے ۔۔۔ خان بہادر عازم الدین نے اس کمرے کو بھی خاص طور سے سجوایا تھا۔ الماریوں میں طرز کہنہ کے ظروف رکھے گئے تھے اور گلدانوں میں پھولوں کے بجائے خوبصورت تراشے ہوئے مصری بُت ۔۔۔ پورا کمرہ آثار قدیمہ کی چیزوں سے مکمل طور پر آراستہ تھا، حد یہ کہ فرنیچر بھی قدیم طرز تھا ۔۔۔

پانچوں دوست انتہائی گرمجوشی سے گفتگو کرنے میں منہمک تھے کہ سلیم دروازہ کھول کر عین اس وقت داخل ہوا جب مصدق ایرانی کہہ رہا تھا "میرے عزیز دوستو! اب تک کی زبردست بحث کے بعد بہرحال میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ یہ دستاویز اصلی ہے اور اس میں بیان کردہ واقعات تاریخی حقائق پر مبنی ہیں ۔۔۔ میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ دستاویز کی صداقت ہر صورت میں ناقابلِ تردید ہے ۔۔۔ اور ہماری مہم کا

مقصد صرف یہ ہے کہ ہم دستاویز میں لکھے ہوئے دعووں کی اصلیت معلوم کریں۔ یعنی زلیخا کا مقبرہ کھود کر اس کا تابوت حاصل کریں اور پھر یہ دیکھیں کہ ہزاروں سال سے سونے والی شہزادی بیدار کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

"میں آپ سے متفق ہوں" احمد ریاض نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ "میں نے خود اکثر کتابوں میں پڑھا ہے کہ سیٹی اول کے دور میں ممی بنانے کے فن نے بے انتہا ترقی کی تھی اس لیے کیا عجب ہے کہ اس فرعون نے کسی زندہ انسان کی ممی بنانے کی اسکیم بنائی ہو اور اس کے لیے شہزادی زلیخا کا ہی انتخاب کیا ہو۔۔۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سیٹی اول اپنے ہر فعل کو مذہبی حیثیت دیتا تھا۔۔۔ اور خدا بننے کا جنون اس کے دماغ میں اس حد تک سما گیا تھا کہ اس نے خود کو "ایپس" دیوتا مشہور کر کے اپنی پرستش شروع کروا دی تھی۔"

"چلیے۔۔۔ میں مانے لیتا ہوں" پروفیسر ارشد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "کہ دستاویز میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے صداقت پر مبنی ہیں لیکن میں چاہوں گا کہ ڈاکٹر بیگ دستاویز میں لکھے ہوئے اس دعوے پر اپنی رائے ظاہر کریں کہ شہزادی زلیخا کو بیدار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسکا تعلق علم عضویات سے ہے۔"

ڈاکٹر بیگ نے جو ابتک اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے جھانک کر استفہامیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔۔۔ میں فوراً کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔۔۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں

زندگی یعنی روح ـــ بیہوشی کی حالت میں ایسی صورت میں اختیار کر لیتی ہے جس کے متعلق سائنس تاریکی میں ہے ـــ مشہور سائنسداں اگسٹ ویسمین نے اس مسئلہ پر جہاں تک روشنی ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کے فعل کے لیئے جسم کے خارجی حالت کی درستگی اشد ضروری ہے ـــ مطلب یہ کہ میری رائے میں جو بالکل ذاتی ہے اس دستاویز کا دعویٰ بالکل باطل ثابت ہوگا۔"

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر شئے کے فعل کے لیئے اس کی تازگی اور خارجی حالات کی صحت مندی ضروری ہے" طہرانی نے مداخلت کی۔

"ہاں ـــ اور اس اصول کا اطلاق صرف جسم انسانی پر نہیں ـــ پودوں اور غلوں کے بیجوں تک پر ہے ـــ" ڈاکٹر بیگ نے اپنے اُلجھے ہوئے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں نے ایک مرتبہ ایک مقبرے میں سے فرعون کی چودھویں نسل کے زمانے کے گندم کے بیج حاصل کر کے بوئے تھے ـــ اور ـــ" طہرانی نے کہا۔

"تو کیا ان سے کوئی فصل پیدا ہوئی ـــ" ڈاکٹر نے طہرانی کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

"نہیں ـــ لیکن اس کے پودے ۱۹ انچ تک بڑھے اور پھر مرجھا گئے" ـــ طہرانی کچھ اور کہتا لیکن ڈاکٹر بیگ نے آہستہ آواز میں کہنا شروع کیا ـــ "تو ان بیجوں میں زندگی کی رمق ضرور موجود تھی ـــ جو مستور تھی

لیکن تھی ضرور ــــ اس قسم کی مثالیں اور بھی ہیں ــــ مثلاً ایک سانپ کو عرصۂ گذشتہ کے چند مشہور و معروف حکماء نے ایک چٹان میں قید کر دیا تھا اور یہ سانپ کئی سو برس تک زندہ رہا ــــ. میں نے خود اپنی آنکھوں سے کشمیر میں ایک سادھو دیکھا تھا. جو اپنی روح کو جسم سے علیحدہ کرنیکا دعویٰ کرتا تھا اور مہینوں بلا کچھ کھائے پیئے زندہ رہتا تھا ــــ لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ کیا گوشت پوست کے ریشے ۳½ ہزار برس تک جیسا کہ دستاویز میں لکھا ہوا ہے صحیح سلامت رہ سکتے ہیں ــــ"

"اگر دستاویز کی تحریر کے بموجب تین سو سال تک سلامت رہ سکتے ہیں تو ۳½ ہزار سال تک بھی باقی رہ سکتے ہیں ــــ" طہرانی نے فوراً کہا ــــ

"خیر ــــ. میں ہر بات مانے لیتا ہوں لیکن یہ کیسے مان لوں کہ کسی زندہ انسان کی ممی بنائی جا سکتی ہے جبکہ ممی بنانے کے لیئے انسانی لاش کو مہینوں نمک اور شورے کے حوض میں ڈال دیا جاتا تھا ــــ اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک زندہ انسان پر وہ عمل کیا جائے. جو ممی بنانے کے لیئے ایک لاش پر کیا جاتا تھا ــــ. میں نے اپنی آنکھوں سے لاتعداد ممیاں دیکھی ہیں ــــ. اور اسی بنا پر میں یہ بات پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں ــــ" پروفیسر ارشد نے گردن کو جنبش دیتے ہوئے کہا ــــ

"اگر آپ دستاویز کی صداقت مانتے ہیں تو پھر اس پر بھی یقین لائیے

کہ فرعون مصر سیٹی اوّل کے حکمار اور کاہنوں نے نہ صرف زندہ انسانوں کی ممی بنانے کا بلکہ روح کی واپسی کا بھی کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور معلوم کر لیا ہوگا ورنہ زلیخا کو ۳½ سو برس تک سات مرتبہ بیدار نہ کرتے اور دوبارہ نہ سُلا پاتے ــــ"

اور طہرانی کے اس جواب نے تقریباً سب کو خاموش کر دیا ــــ.

چند منٹ کی خاموشی کے بعد پروفیسر ارشد اور احمد ریاض دونوں نے بالکل اچانک متفقہ طور پر یہ اعلان کر دیا کہ وہ بھی اس مہم میں شریک ہو رہے ہیں اور خان بہادر عازم الدین کے ساتھ مصر جانے کے لیے تیار ہیں۔ گویا اس طرح اب اس مہم میں چھ آدمی شریک ہو گئے۔ تمام اخراجات کی ذمہ داری خان بہادر نے اپنے ذمہ لے لی ــــ.

اور سیّاح صفت طہرانی کی خوشی و مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ــــ اسکی ۲۸ سالہ قدیم آرزو پوری ہونے جا رہی تھی اور اپنی جوانی کے انتہائی جوشیلے اور مسکراتے دنوں میں اس نے مصر کی قدیم ترین تہذیب اور اس کے انتہائی اہم اسرار کا پردہ الٹنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہو رہا تھا۔ طہرانی کی بوڑھی چھاتی میں زندہ رہنے کی ایک بھرپور امنگ نے انگڑائی لی، آنکھوں میں نوجوانی کی وہ چمک جس کو بڑھاپے نے ماند کر دیا تھا ایک مرتبہ پھر عود کر آئی ــــ. اور بالکل غیر ارادی طور پر ایک فاتح مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی ــــ.

ادھر سلیم بھی سوچ رہا تھا ــــ. آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جب میں

زلیخا کو مجسم نیند بنے ہوئے یا بیداری کی انگڑائی لیتے ہوئے دیکھ سکونگا۔

ایک ہفتہ کے بعد یہ قافلہ دہلی سے بمبئی کے لیئے روانہ ہوگیا۔

یہ ایک ہفتہ آلات حرب، دکھوائی کے اوزار دل اور سفر کے دوسرے سامان کی خرید و فروخت میں انتہائی جوش و خروش سے گذرا، اور کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔

عازم الدین کی بہن شمیم بانو نے بھی پارٹی میں شامل ہونے کی ضد کی لیکن کوٹھی کی حفاظت کے خیال سے انھیں چھوڑ دیا گیا۔ اور وہ نہ جاسکیں۔

قاہرہ جانے والا جہاز بمبئی کے بندرگاہ سے گیارہ بجے رات کو روانہ ہونے والا تھا اس لیئے پارٹی کے افراد نو بجے تک بندرگاہ پہونچ گئے اور جہاز پر سامان پہونچا دیا گیا۔ اب سب کی منزل ایک ہی تھی یعنی قاہرہ۔ اچانک سلیم کی نظریں جہاز کے عرشہ پر پڑیں اور وہ بت کی طرح ساکت رہ گیا۔

زلیخا جہاز کے عرشہ پر موجود تھی اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی ایک ہی منٹ کے بعد وہ دیوانہ وار جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ لیکن قبل اس کے کہ اوپر پہونچتا ایک آدمی سے اسکی ٹکر ہوگئی اور وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آرہا۔

عازم الدین اور اس کی پارٹی کے کسی بھی آدمی کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ چنانچہ جب سلیم نے انھیں

بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے زلیخا کو جہاز کے عرشہ پر دیکھا ہے تو
تو طہرانی کے علاوہ ہر شخص لرز کے رہ گیا۔
طہرانی بہر حال پر سکون تھا ——!!!

باب ــــــــ ۷

بارہ دن کے بحری سفر کے بعد عازم الدین کی پارٹی قاہرہ پہونچ گئی ــ جہاں انھوں نے شیفرڈ ہوٹل میں اپنی قیام کا بندوبست کیا ــ جو قلب شہر میں تھا اور جس کی بالکونی سے شہر کی کئی سڑکیں اور بازار دکھائی دیتی تھیں ۔

عازم الدین اور پارٹی کے دوسرے لوگ لکسر جانے کی تیاریوں میں اور کھدائی کے عملہ تلاش کرنے میں مصروف رہتے تھے اور سلیم قاہرہ کی بازاروں اور مصر کے حسن میں مدہوش رہتا تھا ــ تمام دن وہ سڑکوں پر گھومتا ــ سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھتا، بازاروں کی گھما گھمی دیکھتا ــ اور ان برقع پوش خواتین کو دیکھتا جن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہر شخص کے دل میں ہیجان پیدا کرنے کے لیے کافی تھیں ــ

لیکن اسے تو اُن نیلی آنکھوں کی تلاش تھی ـــــ جو اس کے قلب کا سارا سکون درہم برہم کر چکی تھیں ـــ۔ اور جس نے ایک بہت بڑی حد تک اسے مخبوط الحواس بنا کے رکھ دیا تھا ـــ۔ وہ اکثر سوچتا کیا مصر کا سفر اس کے تاریک خوابوں میں امید کی شعائیں پیدا کر سکتا ہے ـــــ؟ وہ قاہرہ کے مشہور عجائب گھر بھی گیا جہاں سیٹی اول کی ممی ایک تابوت میں رکھی ہوئی تھی ـــ۔ اور جس کی شکل دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی قدیم مہذب مصر کا جلیل القدر حکمران ہے جس نے مصر کو ایک تہذیب و تمدن کی معراج پر اس وقت پہونچا دیا تھا جب یورپ وحشی انسانوں کا مسکن تھا اور امریکہ میں صرف کوہ و صحرا، دریا اور دلدلیں تھیں ـــــ۔ وہ سیٹی اول کی ممی کو دیر تک دیکھتا اور سوچتا رہا کہ یہ وہی سیٹی اول ہے جس کی خداداد فہم و ادراک کی داستانیں آج تک باقی ہیں ـــــ۔ جس نے شہزادی زلیخا کے زندہ جسم پر تاریخ انسانی کا ایک سرتناک تجربہ کیا ہے ـــــ۔ جس کے لبوں نے اس کے خوابوں کی حسینہ سے باتیں کی ہیں اور جس کی آنکھوں نے ان نیلی آنکھوں کو دیکھا ہے جو اس پر سحر طاری کر چکی ہیں ـــــ۔

سیٹی اول کی ممی کے قریب کھڑے ہی کھڑے جیسے سلیم نے عالم تصور میں زلیخا کو دیکھ لیا ـــــ۔ زلیخا کو ـــــ۔ اتنی حسین اور نازک جیسے گلاب کا تازہ کھلا ہوا پھول، تیکھے نقوش، گورے گالوں پر جھکی ہوئی سیاہ لانبی آنکھیں ـــــ نیلی آنکھوں میں شباب کی مستی ـــــ ایک ایسا نسوانی مجسمہ جس میں حسن و شباب کی تمام رعنائیاں موجود ہوں ـــــ

سیٹی اول نے جس زلیخا سے گفتگو کی ہو گی وہ ایسی ہی ہو گی اور سلیم کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔۔۔۔

شام کو پارٹی کے تمام افراد ایک جگہ جمع ہوئے۔۔۔ فیصلہ یہ ہونا تھا کہ یہاں سے کس دن کوچ کیا جائے۔۔۔ اور صرف طہرانی کا انتظار تھا جو ایک معتبر گائڈ کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔۔۔ تقریباً آٹھ بجے طہرانی بھی ایک آدمی کے ساتھ ہوٹل پہونچ گیا۔۔۔ طہرانی کا چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تمام دن دوڑ دھوپ کرتا رہا ہے، اس کا سفید رنگ گرمی کی تمازت سے جھلس کے رہ گیا تھا اور عقاب نما آنکھوں میں انتہائی تھکن کے آثار تھے۔۔۔ عازم الدین نے طہرانی کے ساتھ آنے والے نووارد مصری کو متجسس نگاہوں سے دیکھا۔۔۔ جس کے چھریرے بدن پر سفید دستار و سیاہ لباس اس کو ایک سچا مصری ثابت کر رہا تھا، جس کی آنکھوں سے معصومیت ٹپک رہی تھی اور وہ اپنے آبنوسی عصا کے ساتھ ایک عبادت گذار مصری معلوم ہوتا تھا۔۔۔

طہرانی نے سب سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہا۔۔۔ "اب میں آپ کا تعارف اپنی مہم کے ایک نئے ممبر حسن اصغر سے کراتا ہوں۔۔۔ جو وادیٔ شاہان مصر کے بارے میں وہ سب کچھ جانتے ہیں جو میں نہیں جانتا۔۔۔ میں نے ان کو راضی کر لیا ہے کہ یہ خوابیدہ شہزادی کی خوابگاہ تک ہماری رہبری کریں گے۔۔۔ انھیں کی وساطت سے میں نے ایسے پندرہ مزدوروں کا بھی انتظام کر لیا ہے۔ جو خاموشی اور رازداری کے ساتھ

مقبرہ کی کھدائی کریں گے اور ہم سے ایک دن پہلے لکسر روانہ ہو جائینگے۔"
حسن اصغر نے سب کو باری باری سلام کیا اور اجازت لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

طہرانی نے پھر کہا۔" حسن اصغر اپنے علم کے اعتبار سے قدیم مصر اور اس کے کھنڈرات میں پھیلے ہوئے رازوں کا مخزن ہے۔ پورا مصر اس سے واقف ہے اور مصر کے حکام تک اسکی عزت کرتے ہیں۔ انکی شرکت اس لیئے اور بھی زیادہ مفید ہے کہ ہمیں کھدائی کا کام اپنا مقصد بتائے بغیر حکومت مصر کی نگاہوں سے چھپ کر کرنا ہے اور حسن اصغر اس پر راضی ہو گئے ہیں کہ وہ اس حیرتناک مہم کے بارے میں حکومت مصر کو نہ صرف بالکل تاریکی میں رکھیں گے بلکہ اگر کوئی ناخوشگوار بات ہوئی تو وہ تمام ذمہ داری اپنے سر اوڑھ لیں گے۔"

"خدا کی قسم۔ طہرانی۔ اس مہم کی کامیابی کے لیئے ہمیں ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر حکومت مصر کو ہماری مقاصد یا اسکیم کی تفصیل کا علم ہو گیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔" عازم الدین نے شکریہ کے انداز میں کہا۔

"رازداری کے ساتھ ہی کامیابی ممکن ہے۔" احمد ریاض نے کہا۔

"اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ شہزادی زلیخا کے مقبرہ کی تلاش میں ہمیں زیادہ دقت نہیں اٹھانا پڑے گی کیونکہ عازم الدین صاحب کو ایک پُر اسرار بزرگ کے ذریعہ مقبرہ کی شناخت اور پورا پتہ معلوم ہو چکا ہے

ماسوا اس کے وادیٔ فرعون میں بیشمار مقبرے ہیں کیونکہ اگر وہاں صرف شہزادی کا مقبرہ ہوتا تو ہماری آمد و رفت مشکوک سمجھی جاتی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے یہ مقبرہ بیگمات کے مقبروں کے شمال میں اور مغربی گھاٹی کے کنارے پر بادشاہوں کے مقبروں سے نصف میل چلنے کے بعد ایک پہاڑی کی آڑ میں واقع ہے۔ اور سیاح زیادہ سے زیادہ ملکہ نیفرتاری، ملکہ سیت راع یا سیٹی اول کی محبوب ملکہ کے مقبروں تک جاتے ہیں اور اس کے بعد واپس لوٹ آتے ہیں۔ گویا اس طرح ہم سیاحوں کی نظر سے بھی محفوظ رہیں گے۔" طہرانی نے سفر پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ "اپنے سفر اور اپنی مجوزہ مہم کو چھپانے کے لیے میں نے یہ بھی بندوبست کر لیا ہے کہ کھدائی کرنے والے مزدور ہم سے وادیٔ فرعون سے سات میل دور "فرشت" سے قرنا جانے والی سڑک پر مل جائیں۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ نزدیک ہی "حوارہ" نام کا ایک گاؤں ہے اور وہاں کا شیخ میرا دوست ہے۔"

"پھر اب روانگی میں کیا دیر ہے۔" سلیم نے بیچینی سے پوچھا۔

"بس کل صبح ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔" طہرانی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اور سب کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

سلیم سب سے زیادہ مسرور تھا۔ قاہرہ کے قیام کے دوران میں وہ اہرام مصر اور ابوالہول دیکھ چکا تھا، شہر کے جادو بھرے بازاروں اور گلیوں میں گھوم چکا تھا۔ مصر کی فضاؤں سے اسے محبت ہو چکی تھی اور

جب شب دیجور اپنے بال و پر پھیلاتی تو وہ ایسا محسوس کرتا کہ یہ رات اسکے لیئے اجنبی نہیں ہے ۔۔۔ جیسے ہزاروں برس قبل بھی وہ ان راتوں اور ان راتوں کی تاریکیوں کا لطف اٹھا چکا ہے ۔۔۔ قاہرہ میں آج اس کے قیام کا آخری دن تھا اس لیئے وہ بہترین لباس پہن کر گھومنے نکل گیا اور اس وقت تک گھومتا رہا جب تک کہ وہ تھک کر نڈھال نہ ہو گیا ۔۔۔

اور جب صبح اسکی آنکھ کھلی تو قافلہ کا ہر شخص سفر کے لیئے تیار تھا ۔۔۔ سلیم بھی چند منٹ کے اندر تیار ہو گیا ۔

تمام دن موٹر پر سفر کر کے دریائے نیل کے کنارے والی سڑک پر چلتے چلتے اور نیل کی طغیانی پر آتی ہوئی موجوں کا لطف لیتے ہوئے وہ لوگ شام کے قریب لکسر پہنچ گئے ۔۔۔ ایک جگہ انھیں ریگستان کا ایک مختصر سا علاقہ جس کا نام ممونیہ تھا عبور کرنا تھا لیکن جب لکسر پہنچ کر ایک پُر فضا جھیل کے وسط میں انھوں نے ابو الہول کا ایک مجسمہ دیکھا تو جیسے ان کی ساری تکان دور ہو گئی ۔ لکسر کو اب نیر آباد کہا جاتا تھا ، اور ہزاروں سال پرانے اس قصبہ نے دور جدید کی روشنی میں نہا کر بہت کافی ترقی کر لی تھی ۔۔۔ سلیم کے قافلہ نے وزٹر پیلس ہوٹل میں قیام کیا جس کی طرز تعمیر قدیم مصری انداز میں کی گئی تھی اور جو دور سے کسی مصری فرعون کے محل کا رد ندا ہوا حصہ معلوم ہوتا تھا ۔۔۔ ہوٹل کے چاروں طرف ایک خوبصورت باغ تھا جس کے خوبصورت پودوں اور جھومتے ہوئے درختوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فراشِ قدرت نے ہی اس کی ترتیب اور

تعمیر میں حصہ لیا ہے۔

سلیم اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیر تک باغ کی دلفریبی کا لطف لیتا رہا، اور پھولوں سے معطر ہوا اس کو گہری مسرت اور سکون بخشتی رہی لیکن دھیرے دھیرے اس کو ایک عجیب دل گرفتگی اور پریشانی لاحق ہونے لگی۔ اور وہ بیچین ہو کر کھانے کے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں لاتعداد مسافر رات کا کھانا کھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد اس نے کپڑے بدلے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ تھکن کی وجہ سے اسے بیحد نیند آ رہی تھی لیکن لیٹنے کے بعد جیسے نیند کوسوں دور ہو گئی، اور وہ بڑی دیر کروٹیں بدلتا رہا۔ حد یہ کہ اس نے اکتا کر کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں اب ہوا میں وہ شام کی سی فرحت بخش تازگی نہ تھی اور نہ باغ کے سبزہ میں حیات آفریں کشش۔ پورے ماحول پر ایک عجیب قسم کی افسردگی چھائی ہوئی تھی، آسمان پر جگمگاتے ہوئے تاروں کا رنگ بھی مدھم پڑ گیا تھا۔ ہوا میں تمازت تھی اور فضا میں انتہا درجہ کی اداسی۔ سلیم کافی دیر تک کھڑکی میں کھڑا ماحول کی اس اداسی کا مقابلہ کرتا رہا اور نظروں ہی نظروں میں زلیخا کو تلاش کرتا رہا۔ اس کو حیرت تھی کہ مصر کی زمین پر قدم رکھنے کے بعد سے ابتک شہزادی نے حسب معمول اپنی جھلک کیوں نہیں دکھائی۔ وہ ابھی انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ بالکونی میں ایک روشنی سی ابھر رہی ہے۔ ایک عجیب طرح کی

دھندلی روشنی۔ جو نہ تو چاندنی سے مشابہ ہے اور نہ صبح کاذب کے نور سے ملتی جلتی ہے۔۔۔ بس روشنی۔۔۔ ایک ایسی روشنی۔ جو تاریکی کو دور کر رہی ہو۔۔۔

سلیم کی نظریں اس پُر اسرار روشنی پر جم کے رہ گئیں۔۔۔ کیونکہ زلیخا۔۔۔ اس کے خوابوں کی شہزادی اس روشنی میں موجود تھی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔۔۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے زلیخا کو اتنے خوف سے دیکھا اور خوف سے لرزے بغیر دیکھا۔۔۔ کیونکہ ذہنی طور پر وہ خود زلیخا کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔۔۔ لیکن یہ منظر زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔۔۔ روشنی کا یہ سایہ دھیرے دھیرے تاریکی میں ضم ہو گیا اور زلیخا غائب ہو گئی۔

تمام رات سلیم کو نیند نہ آئی، کیونکہ جب اس کی آنکھ لگتی کوئی چٹکی لیکر اسے جگا دیتا۔۔۔ اور سلیم یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتا کہ یہ سب گرم ہوا کے اثرات بد کا نتیجہ ہے جس نے اس کے اعصاب میں برہمی پیدا کر دی ہے۔۔۔ لیکن کاش سلیم کو معلوم ہوتا کہ۔۔۔ زلیخا تمام رات اس کے کمرے میں موجود رہی اور اپنی لافانی نیلی آنکھوں سے اپنے محبوب کو دیکھتی رہی۔۔۔

اپنے محبوب "احمس" کو۔۔۔ جو اسکی خوابگاہ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا

باب ـــــــــــ ۸

موسم گرما کے خواب سے بیدار ہو کر نیر آباد (لکسر) نے ایک خمار آلود انگڑائی لی اور اس کے بیدار ہوتے ہی قصبہ کی پوری آبادی بیدار ہو گئی۔ سلیم بھی اٹھا اور حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے پہلے اپنے مصری رہبر حسن اصغر سے ملے گا، نہ معلوم کیا بات تھی کہ صبح سے ہی وہ حسن اصغر کے بارے میں بالکل غیر ارادی طور پر سوچ رہا تھا ـــ اور ارادہ کر رہا تھا کہ وہ اس مصری نوجوان سے نہ صرف دوستی کرے گا بلکہ اپنے قیام کا زیادہ حصہ اسی کے ساتھ بسر کرے گا، ـــ ایک لمحہ کے لیئے اسکی نگاہوں کے سامنے حسن اصغر کی پر اسرار شخصیت ایک مجسمہ کی طرح ابھری، ـــ نازک خدوخال، ملیح نظریں، میٹھی آواز، آہستہ گوئی ـــ متین اور پر اسرار چہرہ ـــ اور وہ آنکھیں جن سے ہر وقت ناقابلِ تسخیر

قوت ارادی ابلتی رہتی تھی۔

چنانچہ ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی اس نے حسن اصغر کو بلوا بھیجا اور پھر اس سے پروگرام بنا کر لکسر کی سیر کرنے نکل گیا۔ تمام دن وہ ساتھ گھومتے رہے، باتیں کرتے رہے۔ مسکراتے رہے۔ اور جب شام ہوئی تو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں نے ان دونوں کی محبت اور باہمی خلوص دیکھ کر یہ فیصلہ صادر کیا کہ یہ دونوں آج سے نہیں ہزاروں برس سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

شام کے قریب وہ "قرناق" کے کھنڈرات دیکھنے گئے۔ کافی گرمی تھی، نیلا آسمان بیحد خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اور بھرپور چاند کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا تھا کہ غالباً یہ وہی چاند ہے جس نے بنی اسرائیلیوں کی "آئی سس" دیوی کو جنم دیا تھا۔ ناریل کے جھومتے ہوئے درخت پہریداروں کی طرح چہل قدمی کرتے دکھائی دے رہے تھے، کھنڈرات سے پہلے آبادی کے مکانات چاندنی میں بالکل سفید دکھائی دے رہے تھے اور دور بہت دور سے شہنائی کی میٹھی آواز نیل کی لہروں کی طرح اونچی نیچی ہوتی ہوئی بہت طلسم زدہ معلوم ہوتی تھی۔

وہ جلد جلد قدم بڑھا کر "قرناق" کے کھنڈروں میں پہونچ جانا چاہتا تھا کہ حسن اصغر نے اسکا ہاتھ پکڑ کر اپنی دلکش آواز میں کہا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہم بہرحال قرناق ہی جا رہے ہیں۔ اور اس لیے جا رہے ہیں کہ چاندنی رات میں وہاں کے پرسکون سناٹے کا لطف

اٹھا سکیں ۔"

"میں کب جلدی کر رہا ہوں ۔" سلیم نے مسکرا کر تردید کی۔

"نہیں سلیم ۔ شاید تم ہمیشہ کے جلدی باز ہو ۔" حسن اصغر نے پُر اسرار آواز میں کہا ۔" جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم سب ایک ہی راستہ پر گامزن ہیں تو پھر ہم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کیوں کریں جبکہ ہر وہ چیز جو زندگی ہمیں دے سکتی ہے ہمارے پاس موجود ہے ۔ شام ابھی ختم ہو جائے گی اور رات آجائے گی، یقیناً گذری ہوئی ہر رات کی طرح یہ رات بھی ہماری ہی ہے اور ہمیں اس سے ہر ممکن لطف حاصل کرنا چاہیئے کیونکہ جانے کے بعد یہ رات زندگی میں پھر کبھی واپس نہ آئے گی۔"

"تمھاری گفتگو میں عربی فلسفہ جھلک رہا ہے" سلیم نے کہا۔

"نہیں ۔ قدیم مصری فلسفہ ۔ جو زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا" حسن اصغر نے ہلکی آواز میں جواب دیا اور اپنے قدم آہستہ کر دیئے۔

اب آبادی آگئی ۔ بازار سے گذرتے وقت سلیم نے محسوس کیا کہ اس آبادی میں حسن اصغر کافی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ حسن اصغر کو آتے دیکھ کر بیٹھے ہوئے لوگ ادب سے کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جبتک کہ وہ ان کے قریب سے گذر نہ گیا ۔ دونوں انتہائی سکون سے چلتے رہے حتیٰ کہ "قرناق" کے کھنڈرات جانے والی قدیم سڑک پر پہونچ گئے ۔

"یہ وہی سڑک ہے جو فرعون مصر سیتی اول کی تعمیر کردہ ہیکل رامسیس تک جاتی تھی ـــــ قدیم زمانے میں اس سڑک پر اس سرے سے آخری سرے تک بُت نصب تھے جن کا چہرہ نصوانی اور باقی جسم شیر کا تھا۔" حسن اصغر نے کہا۔

"تو گویا اس سڑک پر زلیخا بھی گذری ہوگی ـــــ" سلیم نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

"ہاں ـــــ زلیخا بھی، ـــــ اس کا محبوب "احمس" بھی احمس کا قریبی دوست گیتاری بھی اور زلیخا کا منگیتر "اسپاتا" بھی۔ کون ہے جو اس سڑک سے نہیں گذرا ـــــ اور سچ پوچھو سلیم ـــــ تو اس سڑک کے ذرّہ ذرّہ میں قدیم تاریخ بکھری ہوئی ہے ـــــ" حسن اصغر نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

"تو کیا ـــــ" سلیم نے پوچھا "احمس کا کوئی دوست گیتاری بھی تھا؟"

"ہاں ـــــ قدیم مصر کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے ـــــ"۔

جلد ہی وہ دونوں ہیکل کے کھنڈر کے نزدیک پہونچ گئے جہاں ہر طرف ایک پُر ہول خاموشی طاری تھی، اس ہولناک خاموشی کے پیش نظر سلیم نے مڑ کر حسن اصغر کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چاند کی روپہلی روشنی میں اسکا چہرہ انتہائی پُر نور ہوگیا ہے ـــــ اس چاندنی میں اٹھے حسن اصغر کا وجود ایک مرمریں مجسمہ کی طرح نصب نظر آیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دوست کی آنکھوں سے روشنی

کی ایک کرن سی پھوٹ رہی ہے، ــــ.

"حسن اصغر ــ" سلیم نے گھبرا کر کہا۔

"میں موجود ہوں ــ" حسن اصغر کے جواب نے اسکو مطمئن کر دیا!

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ دونوں کھنڈر میں داخل ہوئے ــ جہاں ٹوٹے پھوٹے بتوں کی ایک لمبی قطار موجود تھی، ــ کسی بت کی آنکھوں سے نفرت جھلک رہی تھی اور کسی بت کی نگاہوں سے قہر ــ

"یہ بت ہیکل کے پہریدار سمجھے جاتے تھے ــ" حسن اصغر نے کہا اور کئی ابابیلیں پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی اس کے قریب سے گذر گئیں۔

دونوں آگے بڑھتے رہے سلیم سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا تھا لیکن حسن اصغر اس طلسمی تاریکی میں اس لاپرواہی سے چل رہا تھا جیسے سلیم نے نئی دہلی کی سڑکوں سے گذرا کرتا تھا ــ چلتے چلتے دونوں ہیکل کے اس بڑے ہال میں پہونچ گئے جو مصری یادگاروں میں ایک پُرجلال یادگار سمجھا جاتا تھا ــ حسن اصغر اس جگہ کے گوشے گوشے سے واقف معلوم ہوتا تھا، چنانچہ وہ ایک دیوار کے قریب پہونچا اور اپنی آبنوسی چھڑی دیوار پر لگا کر بولا ــ "یہ تحریر اس عمارت کی تاریخ ہے ــ اگر تم کہو تو میں اسکا ترجمہ سنا دوں ــ"

"ہاں ــ لیکن کیا تم قدیم مصری زبان سے واقف ہو" سلیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تم ترجمہ سنو ــ" حسن اصغر نے کہا ــ "اس میں لکھا ہے ــــــ

— بطور ایک خدا کے
ایک معمار کی طرح
میں سیتی — مصر کا فرعون —
جو کچھ امین کے لیے کر سکتا تھا کر چکا ہوں،
میں نے ہیکل میں ایسے چوکور ستون نصب کرا دئے ہیں جن کی
اونچائی آسمان سے باتیں کرتی ہے جو میرا لافانی گھر ہے،
میں نے ایسی برجیاں بنوا دی ہیں جن سے شہر تھیبز دکھائی دیتا ہے،
ایسے پھاٹک بنوا دئے ہیں جو کبھی گر نہیں سکتے،
ایسے باغ لگوا دئے ہیں جن پر خزاں اثر نہیں کر سکتی،
ایسے مرمریں حوض بنوا دئے ہیں جو کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔
میں سیتی — مصر کا فرعون اپنے لڑکے راعمیس کو حکم دیتا ہے کہ وہ
بھی فرعون بننے کے بعد امین دیوتا کی اسی طرح خدمت کرے۔"

ترجمہ کرنے کے بعد حسن اصغر ایک منٹ کے لیے خاموش ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر کہا — "سلیم — یہی وہ عبادت گاہ ہے جہاں کاہن اعظم کے سامنے سجدہ کر کے شہزادی زلیخا نے زندہ ممی بنانے کے لیے اپنے جسم کی پیش کش کی، — یہی وہ ہال ہے جس کے وسط میں کھڑے ہو کر زلیخا نے چیخ چیخ کر اپنے محبوب احمس کی موت پر آہ و بکا کی اور آنسو بہائے یہی وہ جگہ ہے جہاں اس کی اور "اسپاتا" کی منگنی کا اعلان کیا گیا اور یہی وہ جگہ ہے جس کے ایک بلند مینار پر کھڑے ہو کر احمس کا دوست

"گیتا ری" شہزادی زلیخا کے زندہ جسم کے مقبرہ کی تعمیر دیکھتا رہا ـــــ سلیم۔ میں سچ کہتا ہوں یہ جگہ بہت اہم ہے ـــــ اتنی اہم کہ شہزادی زلیخا کی روح ہر روز یہاں ضرور آتی ہوگی ـــــ"

"لیکن کیوں ـــــ" سلیم نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

"اس لیے کہ اسی ہال کی پشت پر باغ کے ایک گوشے میں احمس اور زلیخا نے جوانی اور محبت کے نشے میں چور ہو کر ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی قسم کھائی تھی ـــــ یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ میں ہلاک ہو جانے والے "احمس" کی لاش دیوتا کے آخری دیدار کے لیے لائی گئی تھی اور زلیخا نے نم آنکھوں کے ساتھ اپنے محبوب کے مردہ لبوں کا پیار کیا تھا ـــــ پھر میں کیسے یقین کر دوں کہ زلیخا کی مضطرب روح یہاں نہ آتی ہوگی ـــــ"

لیکن سلیم نے حسن اصغر کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا ـــــ وہ جیسے ماضی کی گمشدہ تاریخ میں کھو کر رہ گیا ـــــ اور جب وہ ہیکل کے کھنڈرات کی سیر کر کے واپس ہوا تو جیسے مصر کا جادو اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا، جیسے اسکا دل کہہ رہا تھا وہ مصر کا تھا ـــــ مصر کا ہے اور مصر کا رہیگا ـــــ

ہوٹل آتے ہی اس نے اپنے باپ عازم الدین سے پوچھا "ڈیڈی ہم شہزادی کے مقبرہ کی کھدائی کے لیے کب یہاں سے روانہ ہونگے ـــــ"

"کل صبح ـــــ" عازم الدین نے جواب دیا لیکن باپ کو حیرت تھی کہ آج اس کے بیٹے کی آواز کیوں بدلی ہوئی ہے ـــــ

رات گئے تک حسن اصغر سلیم کو قدیم مصر کی تاریخ سناتا رہا۔ اس نے کہا۔ "ہم اس وقت دنیا کے قدیم ترین علاقہ میں موجود ہیں۔ جہاں کی تہذیب، تمدن اور سائنس اتنی ترقی کر چکی تھی کہ جب موجودہ دنیا پر اس کے راز منکشف ہونگے تو آج کی دنیا انگشت بدنداں رہ جائیگی۔"

تقریباً گیارہ بجے رات کو حسن اصغر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صبح ہوئی تو عازم الدین روانگی کے لیے بالکل تیار تھے، سب موجود تھے لیکن سلیم اب تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ عاجز ہو کر عازم الدین نے سلیم کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب کوئی آواز نہ آئی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ لیکن سلیم وہاں نہیں تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔

لمحہ بھر کے اندر پورے ہوٹل میں سلیم کی ناکام تلاش کے بعد کھلبلی مچ گئی ہر شخص پریشان تھا۔ لیکن حسن اصغر کے سکون میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی تھی۔ ایک گھنٹے تک وہ ایک کھمبے سے لگا کچھ سوچتا رہا اور اس کے بعد اس نے عازم الدین اور طہرانی کو بلا کر کہا۔ "میں جانتا ہوں سلیم اس وقت کہاں سو رہا ہوگا"

"کہاں ہے؟" دونوں نے گھبرا کر کہا۔

"قرناق کے قدیم کھنڈروں میں ہیکل کے ہال کے پیچھے ایک ایسے گوشے میں جہاں سیٹی اول نے ایک باغ بنوایا تھا۔"

اور واقعی جب پارٹی کے تمام افراد حسن اصغر کے ساتھ ہیکل کے پیچھے

زمانۂ ماضی کے باغ کے اس گوشے میں پہونچے تو سلیم ایک بڑے پتھر پر بے خبر سو رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سنتے ہی سلیم آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا، اس کے چہرے پر ناقابل بیان تازگی اور فرحت تھی ـــــ اپنے چاروں طرف پارٹی کے تمام افراد کو موجود پاکر اس نے کہا ـــ "رات گئے میری طبیعت گھبرائی اور میں آپ میں سے کسی کو کچھ بتائے بغیر یہاں چلا آیا ـــ ڈیڈی ـــ میں سچ کہتا ہوں ایسی فرحت زا رات میری زندگی میں کبھی نہیں آئی، ایسے سہانے خواب میں نے کبھی نہیں دیکھے ـــ ایسی میٹھی نیند میں کبھی نہیں سویا ـــ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میرے یہاں آتے ہی ہواؤں نے مجھے لوریاں دیکر یہاں سلا دیا ـــ"

سلیم کی گفتگو نے ہر شخص کو متاثر کیا ـــ اور ہر شخص پریشان ہو گیا سب سوچنے لگے ـــ "زلیخا ـــ بیدار ہونے سے قبل ہی سلیم کو پاگل نہ بنا دے؟" لیکن طہرانی کچھ اور سوچ رہا تھا ـــ اور حسن اصغر وہ بالکل خالی الذہن ہو کر صرف اس نیلے گلاب کے پھول کو دیکھ رہا تھا جو سلیم کے سرہانے پتھر پر رکھا ہوا تھا اور جس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی ـــ

باب ـــــــــ ۹

سخت الجھنوں کے ساتھ قافلہ کے تمام افراد مع کھدائی کرنے والے مزدوروں کے لکسر سے روانہ ہو گیا ـــــ انھیں ۲۲ میل چلنا تھا،

راستہ میں حسن اصغر اور سلیم میں کافی باتیں ہوئیں اور جب حسن اصغر نے انتہائی پُر اسرار انداز میں سلیم سے دریافت کیا کہ اسے قرناق کے کھنڈروں میں سونے کے بعد کیا خواب دیکھے تو سلیم مسکرا دیا ـــــ دوست پوچھو دوست ـــــ یہ رات کتنی خوبصورت تھی، ہوٹل کے کمرے میں سونے کی نیت سے لیٹنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا کمرہ کسی خوشبو سے معطر ہو گیا ہے ـــ بس یہی خوشبو تھی جس نے مجھ پر ایک وارفتگی سے طاری کر دی ـــ کچھ دیر تک میں نشے کے عالم میں ٹہلتا رہا اور اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس وقت قرناق کے کھنڈروں

میں تنہا تفریح کر دوں۔ بس ۔ حسن اصغر تم یوں سمجھ لو کہ ایک غیر محسوس ہونے والی قوت تھی جو مجھے قرناق کے ہیکل کی طرف گھسیٹ لے گئی اور وہاں جاتے ہی میں ایک پتھر پر سو گیا۔

اب میں نے دیکھا کہ میں ایک قسم کے دیوان خانے میں کھڑا ہوا ہوں جو خیموں کے قیمتی پردوں سے بنایا گیا ہے۔ پرانے وضع کا ایک چراغ شمعدان میں جل رہا تھا اور ریتلی زمین پر صرف ایک قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ دیوان خانے کے بعد ایک خیمہ نما پردہ تھا میں کسی کی اجازت لیے بغیر اس خیمہ کا پردہ اٹھا کر اس میں داخل ہو گیا۔ اس خیمہ میں مینا کاری کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ سونے کا بنا ہوا ایک شمعدان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایک جڑاؤ مسند تھی اور اس مسند پر اپنے مرمریں بازو کو عریاں کئے ہوئے شہزادی زلیخا لیٹی ہوئی تھی۔

حسن اصغر۔ میں سچ کہتا ہوں وہ شہزادی زلیخا ہی تھی،

شہزادی کے جسم پر تقریباً ویسا ہی لباس تھا جس میں میں اسے کئی بار دیکھ چکا تھا، اس کے خوبصورت ہاتھ شانوں تک کھلے ہوئے تھے۔ گلے میں سونے کا ایک جڑاؤ سانپ تھا اور بالوں میں نیلے کا ایک پھول لگا ہوا تھا۔ میرے آتے ہی اس نے اپنی بڑی بڑی بیضوی آنکھوں کو کھولا۔ وہ آنکھیں۔ جن پر اوپر اور نیچے نازک پلکوں کا جالا لگا ہوا تھا۔ بالکل ویسی ہی نیلی آنکھیں جو میرے والد کی لائبریری کی تصویر سے مجھے دیکھا کرتی تھیں۔ وہ آنکھیں جو تغلق آباد میں مجھے

دیکھ کر مسکرا دی تھیں ۔۔۔

میں زلیخا کو بالکل قریب سے دیکھ رہا تھا ۔۔۔ اس کا سفید رنگ، نیلی اور نازک گردن، سنہرے بال، ۔۔۔ باریک ہونٹ، ۔۔۔ اور ایسی جادو بھری آنکھیں ۔۔۔ کہ میری قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ میں بولنا چاہتا تھا لیکن بول نہ سکا۔

حسن اصغر ۔۔۔ میں بیان ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کتنی حسین تھی۔ اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر میں خاموش و ساکت چند منٹ تک اسے غور سے دیکھتا رہا ۔۔۔ کہ ایک خفیف سے تبسم کے ساتھ اس کے لب وا ہوئے، موتیوں کے سے چمکدار دانتوں کی جھلک دکھائی دی ۔۔۔ اور پھر اس نے اپنا سر اونچا کر کے میری طرف غور سے دیکھا ۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے لیکن میں اسکی زبان نہ سمجھ سکا ۔۔۔ چنانچہ جب میں نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا ۔۔۔ اب مجھ پر ایک دیوانگی سی طاری ہو گئی ۔۔۔ میں بالکل سحر زدہ ہو کر اس کے قریب پہونچ گیا ۔۔۔

شہزادی زلیخا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔۔۔

اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی ۔۔۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ۔۔۔ اور حقیقت یہ ہے

کہ ماحول اتنا ڈراؤنا اور ہیبتناک تھا کہ مجھے ڈر کر بیہوش ہو جانا چاہیئے تھا لیکن میں اس خواب کی لذت میں ماحول سے بے نیاز ہو کر ایک مرتبہ پھر سو گیا۔

اب میں نے دیکھا کہ میں دوبارہ اسی خیمے میں ہوں ۔ اور شہزادی زلیخا غصہ کے عالم میں ٹہل رہی ہے ۔ شہزادی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے ۔ وہ بار بار اپنے سینے پر ہاتھ مارتی تھی ۔ اسی سینے پر جس میں ماضی بعید کے بے پناہ راز دفن تھے ۔ اس پریشانی میں بھی وہ دنیا کا حسین ترین مجسمہ معلوم ہوتی تھی ۔ اچانک اس نے اپنا چہرہ اپنے چاندنی جیسے لطیف اور نرم و گداز بازوؤں میں چھپا لیا ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی حور کے چہرے کو نور کی لہروں نے متاثر کر لیا ۔

شہزادی زلیخا رو رہی تھی ۔

وہ روتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا ۔ وہ بار بار خیمہ کا پردہ اٹھا کر باہر کی جانب خونخوار نظروں سے دیکھتی لیکن جب میری طرف دیکھتی تو اس کی نظروں میں غصہ اور نفرت کا شائبہ تک نہ ہوتا ۔ یقین جانو حسن اصغر اس وقت بھی اسکا چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی جادوگر نے ہاتھی دانت کے بنے ہوئے کسی چہرے میں روح پھونک دی ہو ۔

وہ بےچینی کے ساتھ خیمہ میں ٹہل رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ

وہی شہزادی ہے جس نے آج سے ہزاروں برس قبل سورج کو نکلتے اور غروب ہوتے دیکھا تھا۔ جس نے سیٹی اول کے جاہ و جلال کا مظاہرہ دیکھا تھا اور جس نے زندہ ممی کے لیے خود کو پیش کیا تھا۔

اور پھر اچانک زلیخا نے کہا "احمس ۔۔۔ میرے محبوب ۔۔۔ تمھیں معلوم ہوا کہ فرعون میری شادی اپنے ایک رشتہ دار اسپاتا سے کرنا چاہتا ہے ۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا رب رداع کی قسم ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے۔"

اور حسن اصغر ۔۔۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی ۔۔۔ کھنڈر بدستور خاموش تھے، ماحول میں جنگلی پھولوں کی مہک بدستور باقی تھی، ۔۔۔ ہر طرف سناٹا تھا، دور بہت دور سے رات کے پرندوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔۔۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ زلیخا نے مجھے احمس کہہ کر کیوں مخاطب کیا؟

"اس لیے کہ تم واقعی احمس ہو۔" حسن اصغر نے کہا "واقعات کا تسلسل بتا رہا ہے کہ زلیخا کی بےچین اور مجبور روح نے دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے صرف تمھیں اپنے دیدار کے لیے اس لیے منتخب کیا ہے کہ تمھاری شکل و صورت اس احمس سے جو قرناق کے کسی گوشے میں ابدی نیند سو رہا ہوگا بالکل مشابہ ہے اور کیا عجب ہے کہ جسم کے علاوہ تمھاری روح بھی وہی ہو جو احمس کے بدن میں مقید تھی۔"

"مجھے ساری بات بتاؤ حسن اصغر ۔۔۔ تم ادھوری باتیں کہہ کر

میری الجھنیں بڑھا رہے ہو۔" سلیم نے اضطرابی لہجے میں کہا،

"میں نے تمھارے آج کے جاننے کے بعد خود فیصلہ کیا تھا کہ میں تمھیں ساری کہانی سنا دوں ــــ جو ایک عرصہ سے میرے سینے میں گھٹ رہی ہے اور غالباً جس کے بیان اور جس کے خاتمہ کے لیے میں ابتک زندہ ہوں" حسن صفر نے اپنے پُراسرار لہجہ میں کہا ــــ سنو ــــ

میں تمھیں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں وہ تہذیب سے پہلے کی بات ہے، یہ میری کسی عظیم تحقیق یا کسی شاندار دریافت کا نتیجہ نہیں ــــ لیکن اسمیں گذرے ہوئے گمشدہ ماضی اور اپنے دامن میں ہزاروں الجھنیں لیے ہوئے حال کی تفصیل ضرور ہے، کیونکہ ہم دراصل اس مہذب ماضی کے وارث ہیں جس کی تخلیق میں مصر کا بہت بڑا حصہ ہے (وہ مصریوں کا جنھوں نے سب سے پہلے روح کے غیر فانی ہونے کا عقیدہ پیش کیا ــــ

آج کے ایٹمی دور کا مورخ قدیم مصر کی تاریخ کو وحشت اور بربریت کی داستان سے تعبیر کرتا رہتا ہے لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وحشت اور بربریت کے اس عظیم الشان اور لافانی دور کا یہ مصری انسان بہت سی خوبیوں کا بھی مالک تھا، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ موجودہ تہذیب کا اولین معمار بھی وہی تھا ــــ کیونکہ اگر آج کا مہذب اور تعلیم یافتہ انسان کسی دانش گاہ یا ایٹمی تحقیق گاہ کے بلند مینار پر کھڑا ہو کر پیچھے کی طرف دیکھے تو وہ مصر کے انہی وحشی اور بربری انسانوں کو موجودہ علوم و فنون کی داغ بیل ڈالتے دیکھے گا۔

سلیم میرے دوست ـــــ میری اس غیر دلچسپ گفتگو سے اکتانا نہیں کیونکہ میں دراصل تمھاری ہی کہانی بیان کرنے جا رہا ہوں ـــــ. ایک ایسی کہانی جس کا آغاز ہزاروں برس قبل ہو چکا ہے لیکن انجام کا کسی کو علم نہیں ـــــ.

میں تمھیں یہ کہانی نہیں ایک پوری تاریخ سنا رہا ہوں، ـــــ.

دورِ بربریت کا ایک قافلہ نیل کے سرسبز و شاداب کناروں پر رُکا اور اچھی آب و ہوا، نیز پانی کی فراوانی نے اس قافلے سے آگے بڑھنے کا ارادہ چھین لیا، دھیرے دھیرے اہل کارواں کی تعداد بڑھنے لگی، بستیاں آباد ہونے لگیں، آس پاس کے بدوی قبیلوں سے تجارت ہونے لگی ـــــ. اور نیل کا کنارہ انسانی تہذیب کا پہلا گہوارہ بن گیا، چند صدیوں کے بعد نیل دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ـــــ ایک زیریں نیل اور دوسرا بالائی نیل ـــــ. دونوں علاقوں کے لوگ نیل کے پُرسکون پانی کے بیٹے تھے لیکن صدیوں کی علیحدگی نے ان میں اختلاف پیدا کر دیا، فرزندانِ نیل کی یہ دو جماعتیں آپس میں لڑنے لگیں، یہاں تک کہ بالائی مصر کے ایک حکمران نے دونوں مصریوں کو متحد کر دیا ـــــ اس حکمران کا نام "مینس" تھا ـــــ مینس نے "مینس" شہر کی بنیاد ڈالی اور مصریوں کے لیے کچھ مذہبی رسوم بنائیں، اسی مینس کی ایک اولاد نے جس کا نام "خوفو" تھا وہ اہرام بنایا جو آج مصر کا سب سے عظیم الشان اہرام سمجھا جاتا ہے ـــــ.

بالائی مصر کا خاندان پورے مصر پر طاقت اور جبر کے ساتھ حکومت

کر رہا تھا کہ زیرین مصر کے عوام نے بغاوت کر دی، ــــ زیرین مصر آزاد ہو گیا اور "توس مس اول" نام کے ایک سردار کی حکومت قائم ہو گئی ــــ

اسی "توس مس اول" کا ایک جانشین سیٹی اول تھا ــــ مصر کے اس فرعون کو عمارتیں بنوانے کا نئی نئی ایجادوں کا بہت شوق تھا ــــ چنانچہ اس نے ایک زندہ انسان کی ممی بنانے کا فیصلہ کیا اور مصر کے قدیم تاریخ میں شہزادی زلیخا داخل ہو گئی ــــ سیٹی اول کا مقبرہ "تھیبز" کے کھنڈروں میں مل چکا ہے اور اسکی ممی قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔

"سیٹی اول" نے انتہائی طاقت حاصل کرنے کے بعد خود کو فرعون کہا اور اپنی حکمت عملی سے مصری تہذیب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لی، مصر کے طول و عرض میں فرعون کو سورج کا بیٹا سمجھا جانے لگا، وہ دیوتا ہو گیا اور دوسرے دیوتاؤں کی طرح اسکی پرستش کے لیے بھی الگ مندر بنائے گئے، فرعون کی اطاعت ہر مصری پر فرض ہو گئی، مندروں کی حفاظت اور قربانی کے لیے کاہن مقرر کئے گئے، سورج کو سب سے بڑا دیوتا مان لیا گیا ــــ لیکن فرعون کی پرستش لازم قرار دیدی گئی ــــ

اہرام بننے لگے ــــ

اہرام کی تعمیر کا سبب صرف خوف تھا، مصر کے فرعون فنا ہو جانے سے بہت ڈرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد بھی اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کا جسم باقی رہتا ہے لیکن انسانی جسم کے فنا ہوتے ہی روح بھی ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتی ہے، مصر کے فرعون لافانی

بننا چاہتے تھے اس لیئے انھوں نے مرنے کے بعد بھی اپنے جسم کی حفاظت کی:
۔۔۔ اور وہ ایک بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے ۔۔۔
لیکن فرعون مصر سیتی اوّل اسکے آگے بھی کچھ سوچ رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا جب روح فنا نہیں ہوتی، جب جسم محفوظ رکھا جا سکتا ہے تو پھر آیندہ زندگی کا انتظار کیوں ۔۔۔؟ ہم کیوں نہ موت پر قابو پالیں، روح کو جسم کا تابعدار بنا لیں اور قبل اس کے کہ انسان مرے ہم اس کو سُلا دیں تاکہ روح جسم سے نکلنے نہ پائے اور اگر اپنی انتہائی طاقت کے بل پر جسم چھوڑ بھی دے تو اس کے لیئے مجبور ہو جائے کہ وہ دوبارہ جسم میں واپس آئے ۔۔۔ اس نے سوچا ۔۔۔ ایک ایسا تجربہ کیوں نہ کیا جائے ۔۔۔!!!
کسی انسان کو سلا کر اسے زندہ جسم کی ممی کیوں نہ بنائی جائے، جسم کی بھی اور روح کی بھی ممی ۔۔۔ اور اس طرح روح کو ایک مخصوص مدّت تک کے لیئے قید کر لیا جائے ۔۔۔ اس نے اپنے اس فلسفہ پر اپنے حکیموں اور کاہنوں سے مشورہ کیا کہ اور اس کے مشیر اس تجربہ پر تیار ہو گئے، روح، جسم اور مسئلہ تناسخ پر بڑی زبردست بحثیں ہوئیں ۔۔۔ مسئلہ کے ہر پہلو پر پوری سنجیدگی سے غور کیا گیا ۔۔۔ اور مصر کے ہر بڑے حکیم سے اس کی رائے مانگی گئی ۔۔۔ تمام حکماء نے سیتی اول کی تجویز سے اتفاق کیا سوائے ایک کے ۔۔۔ جس کا نام تفیظان تھا ۔۔۔ اس حکیم نے سیتی اول سے کہا ۔۔۔ "کسی جسم کے غیر متناہی ہونے کا خیال ہی بالکل خلاف عقل اور ناقابل یقین ہے ۔۔۔ بلکہ درحقیقت اس خیال کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے، کیونکہ جسم جن

اشیاء کا مرکب ہے وہ بہرحال فانی ہیں ۔۔۔ اب رہی روح ۔۔۔ اور اسکا جسم میں ہمیشہ قید رہنا ۔۔۔ تو انسانی جسم میں ایسی صفت ہے ہی نہیں کہ روح کو ہمیشہ کے لیئے جسم میں باقی رکھا جائے۔

اس حکیم نے فرعون سے کہا ۔۔۔ "اگر تجربہ ہی کرنا ہے تو ایسا جسم تلاش کیا جائے جو تمام مادّی صفتوں سے بالکل پاک ہو ۔۔۔ جو نہ خود مادّہ ہو نہ مادّہ میں ہو ۔۔۔ نہ اس پر موقوف ہو اور نہ اس سے کوئی لگاؤ ہو ۔۔۔ لیکن اے فرعون ۔۔۔ اے سورج کے بیٹے ۔۔۔ ایسا کوئی جسم آج تک تخلیق ہی نہیں کیا گیا ۔۔۔ اس لیئے میرا مشورہ ہے کہ ایسا کوئی تجربہ نہ کیا جائے اس لیئے کہ بلا وجہ ۔۔۔ اس طرح ایک انسان کی جان کا اتلاف ہوگا ۔۔۔"

لیکن فرعون سیتی اوّل اپنی ضد پر قائم رہا ۔۔۔ اور ایک ایسے زندہ انسان کی تلاش ہونے لگی جو اپنا زندہ جسم ممی بنانے کیلیئے پیش کرے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب شہزادی زلیخا اپنے محبوب "احمس" کی جدائی میں رو رہی تھی اور اسپاتا کے ساتھ اس کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا، زلیخا ہر روز شام کے بعد قرناق کے باغ میں آتی اور گلاب کے اس کنج میں بیٹھکر جہاں وہ احمس سے مل کر محبت کے گیت گایا کرتی تھی آنسو بہاتی اور جب رات کی سیاہی پوری طرح پھیل جاتی تو اپنی نم آنکھوں کے ساتھ واپس آجاتی ۔۔۔

سلیم ۔۔۔ میں تم سے کیا بیان کروں کہ اس زمانے میں زلیخا کتنی

پریشان تھی، ــــ اس کی گلابی باہیں سفید ہو گئی تھیں، صحت مند گداز جسم گھل کر رہ گیا تھا، نیلی آنکھیں کسی تالاب کی طرح سوکھ کر رہ گئی تھیں، دمکتا ہوا چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا ــــ اور وہ حزن و ملال اور افسردگی کے ایک زندہ مجسمہ میں بدل کر رہ گئی تھی، ــــ

زلیخا ــــ مجبور اور نامراد زلیخا ــــ ہر رات خواب دیکھتی کہ نیل کے سرسبز کنارے پر وہ احمس کے ساتھ ٹہل رہی ہے ــــ اور احمس نے اسکے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر کہا ــــ "اے میرے دل کے ہر گوشے پر حکومت کرنیوالی ملکہ ــــ ان مست و مدہوش ہواؤں کی قسم، آسمان پر چمکنے والے چاند اور تاروں کی قسم، ــــ میں تمھیں اپنا بنا کے رہونگا۔ خواہ اس کے لیے مجھے ہزاروں برس کیوں نہ انتظار کرنا پڑے ــــ"

اور پھر جیسے فضا میں ایک نیا نغمہ بکھر جاتا ــــ نیل کی لہریں ان دونوں کی پاکیزہ محبت کا یہ منظر دیکھ کر ایک نیا گیت شروع کر دیتیں، اور احمس کہتا ــــ "زلیخا ــــ تمھارے بغیر میری زندگی میں کبھی صبح آئے گی ہی نہیں، اور میں ہمیشہ روشنی کی تلاش میں بھٹکتا رہوں گا ــــ میں سچ کہتا ہوں ــــ تمھاری آنکھوں میں شراب ہے، آواز میں موسیقی ہے، ــــ تم عورت نہیں کلیوں کا تبسم اور پھولوں کی خوشبو ہو، تم میری زندگی کی آخری بہار ہو ــــ تم میرا سب سے حسین تخیل ہو اور فطرت کا سب سے خوبصورت تحفہ ہو ــــ جو میرے لیے اور صرف میرے لیے تخلیق کیا گیا ہے" ــــ

اور پھر زلیخا کہتی ــــ "احمس ــــ اپنی پیاسی محبت کو سیراب کرنے

کے لیے میں بھی اپنی زندگی کے آخری سانس تک تمہارا انتظار کرونگی ــــ"

زلیخا ــــ کی ہر رات انھیں محبت بھرے خوابوں میں کٹ جاتی اور دن ــــ احمس کے انتظار میں کہ وہ جنگ سے واپس نہیں آیا ــــ لیکن ایک دن بالکل اچانک زلیخا کے تمام خواب منتشر ہو کر رہ گئے، خبر آگئی کہ احمس جنگ میں مارا گیا ــــ خبر سنتے ہی زلیخا سینہ پکڑ کر بیٹھ گئی اور اسپاتا کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ــــ

اسپاتا یعنی اس کے منگیتر کو اب بالکل یقین ہو گیا کہ زلیخا کی شادی اب اس سے ہو جائے گی ــــ لیکن زلیخا کچھ اور فیصلہ کر چکی تھی ــــ اس نے اپنے محبوب کے دوست گیتاری سے مشورہ کیا اور ــــ پھر ایک رات خود فرعون سیتی اوّل کے دربار میں حاضر ہو کر زندہ ممی کے لیے اپنا جسم پیش کر دیا ــــ

اور اس طرح میرے عزیز دوست سلیم ــــ زلیخا کی کہانی شروع ہو گئی، وہ کہانی جس کا انجام ابھی باقی ہے ــــ؟

حسن اصغر اس کے بعد خاموش ہو گیا ــــ اور سلیم نے اس کہانی پر اپنا ردِّ عمل نہیں ظاہر کیا ــــ وہ صرف سوچتا رہا ــــ آگے بڑھتا رہا ــــ ماضی کے تاریک پردوں کو چیرتا رہا ــــ اور پھر جیسے اس کے دل کے کسی گوشے سے آواز آئی "میں احمس ہوں" ــــ زلیخا کا محبوب ــــ جس کی جدائی میں اس نے زندہ ممی بننے کے لیے خود کو پیش کر دیا تھا۔

سلیم انتہائی شش و پنج میں مبتلا رہا ــــ چنانچہ تمام راستے وہ کچھ نہ بولا

سوائے اس کے کہ کبھی کبھی اس نے حسن اصغر کی طرف دیکھا جو ایک بُت کی طرح خاموش تھا۔ مصر کے اسرار کی طرح ـــ موت کی طرح ـــ لاش کی طرح ـــ اور جیسے سلیم دل ہی دل میں لرز گیا، ـــ اس کے ذہن میں کئی تصویریں ابھریں اور ڈوبیں، ـــ بس اسے اتنا محسوس ہوا کہ اس نے حسن اصغر کو مصر آنے سے قبل بھی کہیں دیکھا ہے ـــ کہاں دیکھا ہے یہ اسے مسلسل سوچنے کے بعد بھی نہ یاد آسکا۔

ادھر سلیم ان الجھنوں میں تھا اور اُدھر خان بہادر عازم الدین سے جو آج صبح کے حادثے کے کافی پریشان تھے اور جنھیں قرناق کے کھنڈروں میں تمام رات سلیم کے موجود رہنے نے خوفزدہ کر دیا تھا مصدق طرانی کہہ رہا تھا ـــ "حسن اصغر کی شخصیت نے مجھے حیران کر رکھا ہے، لکسر آکر مجھے اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا وہ اس سے قبل مجھے قطعی نہیں معلوم تھا ـــ خان بہادر صاحب اس شخص کے بارے میں مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے مجھے اس پر یقین ہی نہیں آتا ـــ"

"مثلاً ـــ کیا کہا گیا ہے ـــ" عازم الدین نے کہا۔

"لکسر کے رہنے والے معززین نے مجھے بتایا ہے کہ حسن اصغر کے علم کی کوئی انتہا نہیں ـــ وہ اپنی تنہائی کے بیشتر لمحات قرناق کے بھیانک کھنڈروں میں گزارتا ہے، ـــ مصر کی قدیم زبان انتہائی فراوانی سے بولتا ہے جبکہ اس نے کسی درسگاہ میں اس زبان کی تعلیم نہیں حاصل کی ہے۔ اور اکثر رات کی تاریکی میں اسے کسی ان دیکھی شے سے قدیم مصری زبان میں ہمکلام

پایا گیا ہے ــــ"

"حیرتناک ــــ" عازم الدین کے منہ سے بے تحاشہ نکل گیا۔

"یہی نہیں ــــ بلکہ میں نے یہاں آکر یہ بھی سُنا ہے کہ وہ اپنے مرحوم باپ کی شکل سے بالکل مشابہ ہے، اور اسکا باپ اپنے باپ کی شکل سے بالکل مشابہ تھا، یعنی اس کے خاندان میں ہمیشہ ایک ہی اولاد نرینہ پیدا ہوئی اور اس نے ہمیشہ اپنے باپ کی شکل پائی، ــــ گویا اس طرح حسن اصغر کی موجودہ شکل وصورت قدوقامت رنگ وروپ بالکل اپنے جدامجد کا سا ہے، ــــ وہ جدامجد جو شاید یہیں کہیں کسی قبرستان کے زمین دوز تہہ خانے میں کسی تابوت میں سو رہا ہوگا ــــ"

"یعنی آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں سال قبل اس کے مورث اعلیٰ کی جو شکل تھی وہی آج کے حسن اصغر کی بھی ہے ــــ" عازم الدین نے بےچین لہجہ میں کہا ــــ

"ہاں ــــ اور اسی لیے میرا اندازہ ہے کہ حسن اصغر ہمارے قافلہ کی سب سے پُراسرار شخصیت ہے اور وہ شاید کسی خاص مقصد اور کسی اسرار کے تحت ہی ہمارے قافلہ میں شامل ہوا ہے ــــ کیونکہ ــــ" طہرانی کہتے کہتے خاموش ہوگیا،

"ہاں ہاں ــــ کہو ــــ تم کیا کہنا چاہتے ہو طہرانی ــــ" عازم الدین جلدی سے بولا۔

"کیونکہ حسن اصغر ــــ کو میں نے نہیں خود اس نے مجھے تلاش کیا تھا ــــ

قاہرہ کی بازاروں میں از خود وہ مجھے تلاش کر رہا تھا اور جب میں اس سے ملا تو اس نے انتہائی مودبانہ لیکن پُر اسرار لہجہ میں ایک گائڈ کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جبکہ میں نے اس سے اپنی مہم کے بارے میں قطعی کوئی لفظ نہیں کہا تھا۔" طہرانی نے دھیمے دھیمے کہا۔

"گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ حسن اعظم کو پہلے سے ہماری آمد اور ہماری مہم کی تفصیلات کا علم تھا۔" عازم الدین نے گھبرا کر کہا۔

"پہلے میں نے مسئلہ کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن اب میرا یہ خیال ہے کہ وہ ہماری مہم کے بارے میں پہلے سے واقف تھا اور شائد وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہماری مہم کا انجام کیا ہو گا۔" عازم الدین یہ ایک بےچین، مضطرب اور محبت کی ماری ہوئی روح کا معاملہ ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم کس اسرار سے دوچار ہو چکے ہیں۔"

طہرانی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

باب ـــــــ ۱۰

شام کے قریب دہلی کا یہ قافلہ تغلق آباد کے کھنڈروں والے بزرگ کے بتائے ہوئے پتہ پر پہونچ گیا ـــ اور خیمے نصب کر دیئے گئے۔ قافلہ کا قیام سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک وادی میں تھا جو قدیم شہر تھیبز سے فرشت جاتی تھی، شمال کی طرف ایک پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر دورِ قدیم کا تعمیر شدہ ایک ایسا حفاظتی مینار تھا جس کو فرعون کے زمانے میں مقبروں کے محافظ استعمال کرتے تھے، وادی کے اطراف میں جگہ جگہ پتھریلے مکانوں کے ویرانے پھیلے ہوئے تھے ـــ غالباً یہ مکانات بھی محافظوں اور چوکیداروں کی قیام گاہ تھے۔ وادی کے دائیں جانب پتھروں کے ایک انبار پر ایک سنگی سینگ نصب تھا جو تاریخ میں "القرن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

وادی اتنی پُر اسرار سنسان اور ویران تھی کہ غالباً ایک عرصہ سے یہاں کسی زندہ انسان نے قدم نہ رکھا ہوگا، مضافات میں بھی کوئی آبادی نہ تھی، تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ضرور تھا جہاں صرف وہ مزدور رہتے تھے جن کو کھدائی کے لیے حاصل کرلیا جاتا تھا، سلیم کے اس قافلہ میں شامل مزدوروں کی اکثریت بھی اسی گاؤں کی رہنے والی تھی، ـــــ وادی تک پہونچنے کے لیے کسی انجانے آدمی کو پہاڑ کی ناہموار چوٹیوں اور پیچیدہ راستوں کو عبور کرنا پڑتا تھا، ـــــ اس لیے طہرانی کو یہ مقام بہت پسند آیا، ـــــ اسکا کہنا تھا کہ اس طرح ہم ہر ایک کی نگاہ سے چھپ کر سکون اور اطمینان سے مقبرہ کی کھدائی کرسکیں گے۔

ابھی ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی باقی تھی کہ سلیم وادی کی سیر کو نکل گیا، وہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر شفق میں نہائے ہوئے ان بوسیدہ مقبروں کو دیکھنے لگا جو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے ـــــ قریب ہی دریائے نیل انتہائی غرور بھرے انداز میں بہہ رہا تھا، ہر طرف ایک سکوت تھا، دل کو ہلا دینے والا سناٹا تھا، وادی میں اس کے قافلہ کے خیمے نصب تھے، جس میں شام کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی اور آقائے طہرانی اپنے احباب کو یہ بتا رہا تھا کہ اندھیرا ہوتے ہی وہ شہزادی کا مقبرہ تلاش کرنے نکل جائیں گے ـــــ دیر تک سلیم یہ منظر دیکھتا رہا اور جب اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ بھی صبر و سکون کا انتظار کرنے والی ایک گہری

سانس لیکر ٹیلہ سے نیچے اُتر آیا۔

اپنے خیمے کی طرف جاتے ہوئے سب سے پہلے اسکی ملاقات حسن اصغر سے ہوئی جس نے اس سے کہا "یہ روحوں کی وادی ہے سلیم یہاں اکیلے نہیں گھوما جاتا۔ آج کے بعد اسکا خیال رکھنا۔"

شام کا کھانا وسط کے خیمے میں کھایا گیا۔ خلاف معمول آقائے طہرانی بالکل خاموش رہا، دن بھر کے سفر اور تکان سے بوڑھے ایرانی کی سفید جلد سیاہ پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر بیگ نے کھانے کے دوران میں دو ایک مذاق کئے بھی لیکن مہم کے تصوّر میں ڈوبے ہوئے لوگوں نے کوئی خاص توجہ نہ کی۔ اور اسی سکوت و جمود کے ماحول میں کھانا ختم ہو گیا۔

اب بھی سب خاموش تھے۔ کہ اچانک دُور بہت دُور سے ایک میٹھی اور سُریلی آواز سی سُنائی دی، اور اس کے ساتھ ہی گھنٹیوں کی آوازیں بھی۔ ہر شخص خیمے سے باہر نکل آیا۔

آبنوس کے درختوں کے لمبے سائے وادی میں پھیل گئے تھے، اطراف کے کھنڈر چاند کی روپہلی روشنی میں چمک رہے تھے۔ فضا کا سکوت موسیقی کی لہروں سے ٹوٹ چکا تھا۔ دراصل یہ آواز اس قافلہ کی طرف سے آ رہی تھی جو لکسر سے فرشت کی طرف جا رہا تھا۔

حسن اصغر نے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں یہ کارواں "تھوارہ"

نام کے ایک قصبے سے آ رہا ہے اور صرف تاجروں پر مشتمل ہے، اگر ان لوگوں کی ہمارے خیمہ پر نگاہ پڑ بھی گئی تب بھی یہ ہمارے قیام کی نوعیت سے کوئی دلچسپی نہ لیں گے۔"

چند منٹ تک بالکل خاموشی طاری رہی حد یہ کہ گذرتے ہوئے کارواں کی آواز فضا میں تحلیل ہو گئی۔ اب گویا میدان صاف تھا طہرانی نے کہا "میرے خیال میں اب شہزادی کے مقبرے کی تلاش شروع کرنے کا وقت آ گیا ہے، آیئے ہم سب لوگ تیار ہو جائیں۔"

کس میں ہمت تھی کہ وہ طہرانی کے پروگرام میں رد و بدل کرتا۔ آدھ گھنٹہ کے اندر تمام لوگ تیار ہو گئے۔ مہم کے شرکاء نے حسن اصغر کے مشورے پر وہ راستہ اختیار کیا جو عام راستوں سے بالکل مختلف تھا کیونکہ اس میں جگہ بہ جگہ گہرے غار دکھائی دیتے تھے۔ پتھر کے ناہموار ٹیلے تھے، اور خبیثی چٹانیں تھیں۔ ایک گھنٹے کی جدّ و جہد کے بعد وہ ایک ایسے پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ گئے جس کے نیچے تاریکی کی آغوش میں شاہانہ تزک و احتشام سے خاندان فرعون کی بیگمات ابدی نیند سو رہی تھیں اور دور سے وہ قلعہ نما پہاڑ دکھائی دے رہا تھا جو کبھی "دیوی ہاتھرس" کی حیثیت سے مقدس خیال کیا جاتا تھا۔

ہر شخص تھک چکا تھا سوائے حسن اصغر کے۔ جس کے جسم و روح میں ایک سنگی تھکان کے بجائے زندگی کا ایک نیا جوش اور ایک تازگی کمرے میں ایک سنگی کر رہی تھی، آقائے طہرانی اور خان بہادر عا عورت گذشتہ ۳½ ہزار

سال سے سو رہی ہے ۔۔۔ اور صرف اسکی منتظر ہے کہ کوئی اس کو بیدار کر دے ۔۔۔

ڈاکٹر بیگ توہمات کا قائل نہ تھا لیکن اس وقت ٹیلہ کے قریب کھڑے کھڑے اس نے بھی سوچا کہ اگر واقعی زلیخا زندہ ہے تو کیا عجب ہے کہ وہ بھوت بن چکی ہو، اس طرح روح کسی خبیث روح میں تبدیل ہو چکی ہو ۔۔۔ اور جیسے ڈاکٹر بیگ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، از خود آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور وہ اپنی کیفیت چھپانے کے لیے ایک پتھر کا سہارے پر مجبور ہو گئے ۔۔۔ خان بہادر عاذم الدین اور عقد، طہرانی اور پارٹی کے دیگر تمام افراد ۔۔۔ سب کے سب انھیں تاثرات سے دوچار تھے ۔۔۔ کسی انجانے ڈر اور خوف کی وجہ سے ہر شخص خاموش تھا، آنے والے واقعات کے تاریک پہلو ان کے ذہنوں میں انگڑائیاں لے رہا تھا ۔۔۔ کیونکہ اگر کسی کو ہوش تھا تو وہ یہ ضرور دیکھتا کہ ۔۔۔ حسن اصغر ٹیلے سے ذرا ہٹ کر کر آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے کہہ رہا ہے ۔

"زلیخا ۔۔۔ اے مجبور و بیکس اور مظلوم شہزادی ۔۔۔ آخر کار تیری بیداری کا وقت آ ہی گیا ۔۔۔ اے میرے دوست کی لافانی محبوبہ اگر تو دیکھ سکتی ہے تو دیکھ لے کہ تیرا محبوب بھی تیرے جسم کے بالکل قریب ہی ہے ۔۔۔ ہزاروں سال گذر گئے نہ تیرے محبوب کے خدوخال میں فرق آیا اور نہ تیرے محبوب کے دوست میں، متعدد دفعہ پیدا ہونے کے باوجود کوئی تبدیلی آئی ۔۔۔

اے سونے والی شہزادی اگر تو سُن سکتی ہے تو سن ـــــ!!! کہ اب وہ دن دور نہیں جب تیرا محبوب نوجوان احمس تیرے تابوت کے بالکل قریب کھڑا ہوگا، تیرا آخری رفیق گیتاری بھی تجھ سے باتیں کر رہا ہوگا اور تو ـــــ جس نے اپنے محبوب کے حصول کے لیے اتنی بڑی قربانی دی تھی ہزاروں سال گذرنے کے بعد بھی ایک مرتبہ پھر جوانی، زندگی اور مسرت سے بھرپور انگڑائی لے گی ـــــ"

حسن اصغر ـــــ ابھی غالباً کچھ اور کہتا کہ اچانک آقائے طہرانی نے جو اس قسم کے کھنڈرات اور بعید از قیاس حوادث سے متعدد مرتبہ دوچار ہو چکا تھا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور دھیمی لیکن مطمئن آواز میں کہا۔ "آخر کار ہم اس مقبرہ کے پوشیدہ پھاٹک کے قریب بلا کسی جد و جہد اور پریشانی کے پہونچ ہی گئے جس کا قدیم دستاویز میں تذکرہ تھا ـــــ اسلیئے میرے دوستو اب ہراساں ہونے یا کسی خبیث روح کے تصور سے لرزاں ہونے کی ضرورت نہیں ـــــ آج کا کام ختم ہوا آیئے اب واپس چلیں ـــــ"

قافلہ کے افراد جس راستے سے آئے تھے اسی سے اپنی قیام گاہ واپس بھی لوٹ آئے ـــــ لیکن اس رات کوئی فرد ایک لمحہ کے لیئے بھی نہ سو سکا ـــــ

باب ـــــــــ ۱۱

اسی رات سوتے سوتے سلیم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے خیمہ میں سونے کے بجائے وادیٔ بیگمات فرعون میں ایک چٹان کے قریب کھڑا ہوا ہے ـــ سلیم نے سوچا کہ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے لیکن جب اس نے خود کو اچھی طرح پرکھ لیا کہ وہ واقعی حالت بیداری میں ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی ـــ اس نے سوچا کہ وہ اپنے خیمے سے یہاں تک کیسے آگیا ـــ اور پھر اسے اپنے پُراسرار دوست حسن اصغر کے یہ الفاظ بھی یاد آگئے ـــ "سلیم ـــ یہ ہزاروں سال پرانی روحوں کا مسکن ہے آج کے بعد یہاں رات کو تنہا کبھی نہ آنا ـــ"

اور حسن اصغر کے یہ الفاظ یاد آتے ہی سلیم کانپ گیا ـــ ابھی وہ یہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ جلد از جلد اپنی قیام گاہ کی طرف واپس لوٹے کہ اچانک

اس نے دیکھا کہ چٹان کے قریب ایک سفید سایہ ابھر رہا ہے ـــــ. قریب تھا کہ خوفزدہ سلیم کے منھ سے ایک دلدوز چیخ نکل جاتی کہ بالکل خلاف توقع اس کے کانوں میں آواز آئی ـــــ "احمس ـــــ یہ میں ہوں تمھاری محبوبہ زلیخا ـــــ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ـــــ"

یہ جملہ قدیم مصری زبانوں میں ادا کیا گیا تھا اور سلیم کو حیرت تھی کہ اس نے یہ زبان نہ جانتے ہوئے بھی اس جملہ کا مطلب کیسے سمجھ لیا ـــــ؟

اے کاش سلیم کو معلوم ہو جاتا کہ ایسا سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟

اب سلیم یعنی احمس نے دیکھا کہ سفید پرچھائیں نے دھیرے دھیرے ایک انسان کی شکل اختیار کی ـــــ خد و خال ابھرے ـــــ لباس واضح ہوا، نیلی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، سنہرے بال ہوا میں لہرائے ـــــ اور پرچھائیں کی جگہ ایک مرمریں تراشیدہ جسم اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا ـــــ.

سلیم نے غور سے دیکھا ـــــ زلیخا اس کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ دیر تک حسن و خوبصورتی کے اس خاموش پیکر کو دیکھتا رہا ـــــ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چاند کی کرنوں نے عورت کا روپ اختیار کر لیا ہے ـــــ ایک ایسی عورت کا روپ جس کا لباس بھی چاند کی روپہلی کرنوں سے بنایا گیا ہے ـــــ.

"احمس ـــــ" ایک مرتبہ پھر فضا میں چڑیوں کی چہکار جیسی آواز پھیلی، آواز بالکل نزدیک سے آئی تھی لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ

آواز دور بہت دور سے ماضی کے تمام پردوں کو چاک کرتی ہوئی، ہزاروں لاکھوں میل کا فاصلہ چشم زدن میں طے کرتی ہوئی آ رہی ہے۔۔۔ اور جیسے یہ آواز نہ ہو، کھلے ہوئے شاداب پھولوں کی بارش ہو جس نے پورے پورے ماحول کو اپنی خوشبو سے معطّر کر دیا ہو۔۔۔

"احمس ۔۔۔ تم خاموش کیوں ہو ۔۔۔ آؤ ۔۔۔ میرے قریب آؤ ۔۔۔"

قدیم مصری زبان میں ایک مرتبہ پھر ایک نغمہ سا بکھرا ۔۔۔ لیکن سلیم دم بخود رہا ۔۔۔ وہ سلیم سے احمس میں تبدیل ضرور ہو چکا تھا لیکن اپنی شعوری کیفیات کی بیداری کی وجہ سے ابھی وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس وقت وہ خان بہادر عازم الدین کے بیٹے سلیم کے بجائے زلیخا کے محبوب احمس میں تبدیل ہو چکا ہے۔۔۔

لیکن اس کے یہ احساسات بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہے، آہستہ آہستہ اسکی شعوری کیفیات ڈوبتی گئیں۔۔۔ اور وہ زلیخا کی آواز کی موسیقی میں اس طرح کھو گیا کہ اسے گذرتے ہوئے وقت کی خبر نہ رہی، ۔۔۔ زلیخا کی نیلی آنکھیں بدستور اسکی طرف دیکھ رہی تھیں ۔۔۔ وہ آنکھیں جن میں ہزاروں سال کا دم توڑتا ہوا انتظار جھلک رہا تھا، ۔۔۔ اور پھر جیسے ان پاک اور معصوم آنکھوں کے سحر نے سلیم کے ذہن کی تمام الجھنوں کو چاند کی نرم اور شفاف کرنوں نے دھو دیا۔۔۔

اب وہ بھی احمس تھا ۔۔۔ سلیم کے بجائے احمس ۔۔۔ جس کے جسم پر موجودہ دور کے شب خوابی کے لباس کے بجائے قدیم مصری لباس

بھی تھا۔

اور زلیخا کے ہونٹوں پر ایک میٹھی اور فاتحانہ مسکراہٹ ناچ اٹھی، ــــ اس نے مسحور کن انداز میں ایک ہلکی سی انگڑائی لی اور پھر احمس کے بالکل قریب آگئی۔ ــــ

وقت ہمیشہ آگے کی طرف بھاگتا ہے لیکن آج قدیم مصر کی اس ہولناک وادی میں جب ہزاروں سال سے بچھڑی ہوئی روحوں کا ملاپ ہوا تو وقت پیچھے کی طرف واپس ہو چکا تھا۔ ــــ احمس اور زلیخا ایک دوسرے کے بالکل نزدیک تھے۔ ــــ اور ماضی حال اور مستقبل کا تمام فرق ختم ہو چکا تھا۔

ماحول کی رومان انگیزی، ــــ گرد و پیش کی تنہائی اور جذبات کی وارفتگی کے تحت احمس نے چاہا کہ وہ زلیخا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے کہ محبت سے خالی دل کے ساتھ وہ ہمیشہ پیدا ہوتا رہا اور اس کے انتظار میں موت کی وادی سے پرچھائیں کی طرح گذر کر ہمیشہ اس دنیا میں واپس آتا رہا لیکن اسے زلیخا نہ ملی، ــــ لیکن خلاف توقع زلیخا نے اس سے کہا ــــ "میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہ کرو احمس ــــ تم زلیخا کے جس جسم کو دیکھ رہے ہو وہ اسکا جسم نہیں اس کی روح کا عکس ہے ــــ اور روح کو کسی خاص قوت ارادی کے تحت دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا ــــ"

"پھر مجھے بتاؤ کہ تمھاری روح کی پرچھائیں کب تک میری آنکھوں

کو سوگوار بناتی رہے گی اور کب وہ وقت آئے گا جب ہماری روحوں کو اپنے اصل جسم میں واپس آنے اور ایک دوسرے سے ملنے میں کوئی مادی یا روحانی پابندی نہ ہوگی۔" احمس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر کہا ——

"احمس —— انتظار کے طویل لمحات اب ختم ہو چکے —— اور وہ دن دور نہیں جب تم میرے مقبرہ کا زمین دوز دروازہ توڑ کر میرے سنگی تابوت کا ڈھکنا اٹھا رہے ہوگے۔ بس —— یہی دن میری لمبی نیند کا آخری دن ہوگا —— میں بیدار ہوں گی اور اس کے بعد —— احمس —— صرف تم ہوگے، میں ہوں گی، اس دنیا کی سرسبز و شاداب وسعتیں ہوں گی، پھول کی خوشبو ہوگی، زندگی کا رقص ہوگا، میرے اور تمہارے دل کی دھڑکنوں کی یکجائی ہوگی اور مستقبل ایک نہ ختم ہونے والے قہقہے میں تبدیل ہو جائیگا ——

اس لیے احمس —— مقبرہ کا دروازہ توڑنے کے لیے جلدی کرو —— اب مجھ میں انتظار کی مزید قوت باقی نہیں رہی ہے —— میری روح کی بیچینی اپنی انتہائی معراج پر پہونچتی جا رہی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے سنگی تابوت کے اندر میرا دم گھٹ کر رہ جائیگا۔"

"اطمینان رکھو زلیخا —— تمہاری نیند کی مدت ختم ہو چکی ——" احمس نے کہا —— اور جیسے سفید پرچھائیں فضا میں بتدریج تحلیل ہونے لگی —— زلیخا کا روحانی وجود چاند کی کرنوں میں ضم ہونے

لگا، ـــ. اور جب دور بہت دور سے آواز آئی ـــ "میں جا رہی ہوں ـــ میں جا رہی ہوں ـــ"۔

زلیخا چلی گئی لیکن احمس دوبارہ سلیم میں تبدیل نہ ہوا۔

اب ماحول بالکل بدل گیا تھا، سرد اور اداس ہواؤں نے فضا کو غمزدہ کر دیا تھا، زلیخا کے جاتے ہی چاروں طرف ایک عجیب اداسی بکھر گئی تھی، کھجور کے جھومتے ہوئے درخت چاند کی کرنوں کی لوریاں سن کر سو گئے تھے ـــ احمس بالکل خاموش کھڑا تھا ـــ نہ سو رہا تھا نہ جاگ رہا تھا ـــ ماضی کے گمشدہ دن اور محبت میں ڈوبی ہوئی راتیں اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگیں ـــ حد یہ کہ چاند کی روشنی پھیکی پڑنے لگی ـــ اور پھر بالکل اچانک اس کے بالکل قریب ایک تیز بدبو پھیل گئی ـــ

"ابھی فضا میں خوشبو تھی، ہواؤں میں مہک تھی لیکن ابھی پلک جھپکنے میں یہ بدبو کیسی پھیلی ـــ" احمس نے سوچا اور ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اس نے دیکھا ـــ اس کے قریب ایک اور سایہ ابھر رہا ہے، ـــ لیکن اف یہ سایہ زلیخا کے برعکس کتنا بھیانک، ـــ کتنا ہیبتناک اور کتنا لرزہ خیز تھا، ـــ مضبوط دل والا احمس بھی اس سایہ کو دیکھ کر ڈر گیا ـــ

"میں اسپاتا ہوں ـــ زلیخا کا منگیتر ـــ وہ جس سے شہزادی کو نفرت تھی، ـــ وہ جو شہزادی کے حسن کا دیوانہ تھا ـــ اور وہ جس کی منگنی کا اعلان خود فرعون سیٹی اول نے کیا تھا ـــ"

"میں سمجھ گیا ــــ لیکن تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو ــــ؟"

"اس لیے آیا ہوں کہ جہاں تم زلیخا کی بیداری کا انتظام کر رہے ہو وہاں اس کے لیے بھی تیار رہو کہ مجھ سے مقابلہ کرنا ہے ــــ مجھ سے ــــ یعنی اسپاتا سے ــــ جو ہر حال میں زلیخا کو حاصل کر کے رہیگا ــــ اس لیے کہ وہ فرعون کے اعلان کا احترام کریگا ــــ"

احمس ــــ تم یہ نہ سمجھنا کہ اسپاتا مر چکا ہے ــــ اگر زلیخا زندہ ہے، اگر احمس زندہ ہے تو اسپاتا بھی باقی ہے ــــ اسکا ارادہ بھی باقی ہے اور اس کی منگنی بھی باقی ہے ــــ

ــــ بس یہی کہنے کے لیے میں یہاں وادی میں آیا تھا ــــ اور اب آخری انتباہ کے بعد دوبارہ اپنی لحد میں واپس جا رہا ہوں ــــ"

احمس کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ سایہ بھی فضا کی لامحدود وسعتوں میں تحلیل ہو گیا ــــ اب وہ پھر تنہا تھا ــــ لیکن نرم ہوا کے جھونکے بدستور اس کے چاروں طرف رقص کر رہے تھے ــــ

دفعتاً احمس نے محسوس کیا کہ وہ ایک گہرے اور تاریک غار میں گرتا جا رہا ہے ــــ دھند کی ایک دبیز چادر اس کو اپنے چاروں طرف لپیٹتی جا رہی ہے ــــ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں ــــ اور پھر جیسے کسی مضبوط ہاتھ نے اس کو سنبھال لیا ہو ــــ

اور یہ ہاتھ اس کے دوست حسن اصغر کا تھا ــــ جو اس کو صبح ہونے کے بعد جگا رہا تھا ــــ سلیم نے اپنے پلنگ پر لیٹے لیٹے آنکھیں کھولیں ــــ

— رات کے تمام واقعات اس کو اب تک یاد تھے۔ اس نے چاہا کہ وہ حسن اصغر کو سب کچھ بتا دے۔ لیکن قبل اس کے کہ اسکی زبان سے ایک بھی لفظ نکلتا حسن اصغر خود ہی بول اٹھا —

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو — اس لیے تم اپنی زبان نہ کھولو — تمھیں یہ سن کر واقعی حیرت ہو گی کہ رات کو جب تم سلیم کے بجائے احمس تھے — میں بھی تمھارے ساتھ تھا —"

"تم میرے ساتھ تھے —؟" سلیم نے ڈر اور خوف کی وجہ سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں — یقین کرو سلیم — جب سے تم نے سرزمین مصر پہ قدم رکھا ہے میں ہر وقت تمھارے ساتھ رہتا ہوں، — تمھاری خبر گیری کرتا رہتا ہوں اس لیے کہ لاشعوری طور پہ ہم دونوں کا مقصد ایک ہے —"

"کونسا مقصد —؟" حسن اصغر — پچھلے کئی دن سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم ہر بات معمہ میں کرتے ہو —"

"زلیخا کی بیداری ہم دونوں کا مشترکہ مقصد ہے — لیکن جہاں تک معمہ کا تعلق ہے اگر کل رات تم مجھے دیکھ لیتے تو شاید سمجھ جاتے کہ نہ میں کوئی معمہ ہوں اور نہ میری گفتگو میں کوئی معمہ ہے — بہر حال جلد تیار ہو جانا — آج یہاں کے کھنڈرات کی سیر کرنے چلیں گے۔"

حسن اصغر یہ کہہ کر چلا گیا لیکن سلیم کی الجھنیں بدستور باقی رہیں وہ سوچتا رہا — "زلیخا کی بیداری ایک ہیبتناک اسرار کیوں بنتی جا رہی ہے،

حسن اصغر میرے وجود میں اتنی غیر معمولی دلچسپی کیوں لے رہا ہے ـــــ میں آواگون کا قائل نہیں ـــــ پھر زلیخا مجھے اس کیوں سمجھتی ہے ـــــ جب سے میں مصر آیا ہوں مصر کے ماضی میں کیوں دلچسپی لے رہا ہوں ـــــ مصر کی تاریخ اور اس کے کردار مجھے جانے پہچانے کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

ایسے ہی ہزاروں سوال تھے جو ایک بھنور کی طرح سلیم کے ذہن میں ابھرتے اور ڈوب جاتے ـــــ لیکن مسئلہ پر ہر طرح سے روشنی ڈالنے کے باوجود سلیم کو کنارہ نہ ملا ـــــ

ابھی سلیم نہا دھو کر تیار ہی ہوا تھا کہ آقائے طہرانی، عازم الدین اور حسن اصغر پارٹی کے دیگر افراد کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئے ـــــ پروگرام یہ بنا تھا کہ آج دن کی روشنی میں ہی مقبرہ کے اطراف کا معائنہ کر لیا جائے تاکہ بعد میں کھدائی کے وقت کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے ـــــ

پارٹی کے تمام افراد کا کہنا تھا کہ خلاف توقع پہلی ہی رات کو شہزادہ کا مقبرہ مل جانا مہم کے لیے ایک نیک شگون ہے اس لیے اب آئندہ اقدامات کے سلسلے میں وقت برباد نہ کیا جائے ـــــ طہرانی نے آج تین مزدور بھی ساتھ لے لیے تھے ـــــ اور خلاف معمول آج وہ اپنے کاندھے پر ایک بندوق بھی لٹکائے ہوئے تھا ـــــ

ٹھیک ۱۰½ بجے دن کو پارٹی زلیخا کے مقبرہ کی طرف روانہ ہو گئی، تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک وسیع شاہی قبرستان کے کھنڈروں سے

گذرے جہاں مصر قدیم کے شہنشاہ، بیگمات، حکمار، اور کاہن آبائے سلف کی تہذیب، تمدن اور تاریخ کو لیے ہوئے ابدی نیند سو رہے تھے، ایک ایسی تہذیب جس کا دعویٰ آج کے ان ویرانوں نے ہزاروں سال پہلے جب کیا تھا جب پوری دنیا پر جہالت کے تاریک پردے پڑے ہوئے تھے۔

ہر طرف غضب کی خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔

دفعتاً عازم الدین نے طہرانی سے پوچھا "طہرانی تمہارے خیال میں شہزادی کے سنگی تابوت تک پہونچنے میں کتنے دن صرف ہونگے؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اسکا انحصار پتھروں کی کھدائی اور کٹائی پر ہوگا۔ اگر پتھر مضبوط ہوئے اور مسالہ سخت ہوا تو ممکن ہے کہ ہمیں ایک ہفتہ لگ جائے، دوسری بات یہ کہ ہمیں مقبرہ کے اندر کی عمارت اور اسکی ساخت کا کوئی اندازہ نہیں۔ ہمیں یہ تک نہیں معلوم کہ مقبرہ کے داخلی دروازہ کے بعد راستہ صاف ہے یا نہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ داخلی دروازہ کے بعد بھی اصل مدفن تک پہونچنے کے لیے کئی مضبوط دروازے توڑنا پڑتے ہیں۔ ایسی صورت میں دشواریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔"

حسن اصغر نے بھی طہرانی کی بات سنی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ بات کو آگے بڑھائے اور پارٹی کے تمام افراد کو یقین دلائے کہ مقبرہ کا داخلی دروازہ توڑنے کے بعد شہزادی کے سنگی تابوت تک پہونچنے

میں کوئی دشواری نہ ہوگی لیکن نہ معلوم کیا سوچ کر وہ خاموش رہا ــــ البتہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ضرور پھیل گئی ــــ

اب دھوپ بڑھ گئی تھی اور گرمی کی شدت نے سب کو پریشان کر دیا تھا چنانچہ طہرانی کے مشورہ پر یہ قافلہ ایک جگہ آرام کرنے کے لیے ٹھہر گیا ــــ اس جگہ سے ایک مسمار شدہ مقبرہ کے کھنڈر بالکل صاف نظر آرہے تھے ــــ طہرانی نے ان کھنڈروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "فرعون کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ظالم، جابر، سنگدل اور ملحد کردار ابھر آتا ہے لیکن غالباً بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ متعدد فرعون بہت ہی نیک دل اور مثالی کردار کے حامل تھے ــــ مثلاً ــــ یہ سامنے والے کھنڈر جس فرعون کے مقبرے کے ہیں وہ دیانت، صداقت، انصاف، سادگی، اخلاص اور انسانیت نوازی کا زندہ مجسمہ تھا"

طہرانی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیکر اپنی بات دوبارہ شروع کی ــــ "اس فرعون کا نام اخناتون تھا اور قدیم تاریخ کے اندازے کے بموجب حضرت موسیٰ کی پیدائش سے تقریباً اسی برس قبل اسکا انتقال ہوا تھا ــــ عام فراعنہ کے بالکل برعکس اخناتون موحد تھا ــــ یہ فرعون قدیم تاریخ کا پہلا شہنشاہ ہے جس نے حکومت کی پالیسی اور اپنے آباء و اجداد کی روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود کو خدا کہلوانے کے بجائے مصر کی اصنام پرستی کی زبردست مخالفت کی اور

توحید کا نعرہ بلند کر کے مصری عوام کو ایک نیا فلسفہ اور ایک نیا انداز فکر دیا ــــ

"اخناتون" صرف ۱۷ سال حکومت کرنے کے بعد محض ۳۸ سال کی عمر میں مر گیا لیکن اس کے دور حکومت میں دنیا کی تاریخ میں جو اہمیت حاصل ہے وہ دنیا کے چند ہی حکمرانوں کے ادوار کو نصیب ہو سکی ہے، اس موحد فرعون سے قبل ہر فرعون کو "را" یعنی سورج دیوتا کا ارضی بیٹا سمجھ کر پوجا جاتا تھا اور مصریوں کے مذہب پر لاتعداد دیوی دیوتا مسلط تھے ــــ چنانچہ جب "اخناتون" بھی تخت پر بیٹھا تو اس کی بھی پرستش کی گئی ــــ

میں اخناتون کا یہ قصہ محض وقت گذاری کے لیے نہیں سنا رہا ہوں بلکہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس کا تعلق شہزادی زلیخا سے بھی ہے۔

بچپن ہی سے "اخناتون" کا معصوم ذہن مصر کے ان گنت خود ساختہ خداؤں سے بھٹک کر خالق حقیقی کی تلاش میں بے چین رہتا تھا ــــ کمسن فرعون زادہ مہکتے چمن زاروں میں گھنٹوں پرندوں کے نغمے سنتا، سورج کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھتا ــــ اور پھر دل ہی دل میں سوچتا کہ ان تمام چیزوں کی تخلیق کسی انسان کی قوت میں ممکن نہیں ــــ

"اخناتون" کا باپ فرعون امخوطپ سوم نے جو یہ خبریں سنیں تو اس نے گوتم بدھ کے باپ کی طرح یہی حل نکالا کہ کمسنی ہی میں بیٹے

کی شادی کر دی جائے ۔ چنانچہ اس نے "متانی"[1] کے آریائی حکمران "دشرتا" کو پیغام دیا کہ وہ اپنی بیٹی "تادو خیپا" کی شادی اس کے لڑکے سے کر دے۔ دشرتا نے فوراً یہ رشتہ قبول کر لیا ۔ اور اپنی دس سالہ لڑکی "تادو خیپا" مصر روانہ کر دی ۔ جہاں سب سے پہلے اسکا مذہب تبدیل کر کے اس کا نام "نفرتی" رکھا گیا اور پھر اخناتون سے اسکی شادی کر دی گئی ۔ ابھی اس ایشیائی مصری بیاہ کے شادیانے فضاء میں گونج ہی رہے تھے کہ اخناتون کے باپ کا انتقال ہو گیا اور پجاریوں کے متفقہ فیصلہ کے بعد اسے فرعون بنا کر تخت پر بٹھا دیا گیا ۔ لیکن جلد ہی مصر کے طاقتور کاہنوں کو محسوس ہو گیا کہ ان کا نیا فرعون ان کی نظریاتی اور مذہبی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ۔

اخناتون ۔ گیارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور محض چھ سال کے بعد ایک دن اس نے خداوندی سے متعلق تمام مصری نظریے ٹھکرا کر ایک اَن دیکھے خدا کا نظریہ پیش کر دیا ۔ اور اپنے اس خدا کی تبلیغ کے لیے اس نے اپنی تمام قوت صرف کر دی ۔ پورے ملک میں "آمن" کی پرستش بہ جبر ختم کر دی گئی ۔ پجاریوں کے تمام اختیارات ، وسائل ، اوقات اور وظائف ضبط کر لیے اور "شیبہ" میں اپنے اس اَن دیکھے خدا کی عبادت کے لیے ایک عظیم الشان مندر بنوا دیا ۔ جو آج بھی تاریخ

---

[1] متانی ۔ موجودہ عراق اور ایران کے درمیان ایک آزاد آریائی ملک تھا جس سے مصر کے دوستانہ تعلقات تھے ۔

میں "جم آئن ام پرتن" کے نام سے مشہور ہے۔

پجاریوں کی قوت اور دینی سیاسی طاقت کو ختم کرنے کے لیے اس نے موجودہ قاہرہ سے ۱۷۰ میل دور ایک نئی راجدھانی تعمیر کرائی اور اسکا نام "آخت اتن" رکھا۔ آفتاب پرستوں کے اس فرعون نے اپنی نئی راجدھانی میں آکر اعلان کیا کہ آفتاب بھی کوئی نہ کوئی مادہ ہے اس لیے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا کہ سورج خدائے برحق کی ایک عظیم تخلیق کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور ہم سب کا خالق تمام مادی خواص سے مبرّا ہے۔

اخناتون نے اپنے اس خدا کی مزید وضاحت کی اور کہا کہ میرا خدا زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے، مادی قیود اور خواہشات سے آلودہ نہیں ہے، وہ کسی خاص ملک، فرقے یا قوم کے لیے مخصوص نہیں ہے، اور نہ اسکا جسم انسانی اور حیوانی اعضاء سے مرکب ہے۔" اس نے ایک دن تمام پجاریوں کو بلا کر کہا کہ "میرا خدا دنیا کی تمام بڑی سے بڑی قوتوں سے بالاتر اور رب العالمین ہے۔ وہ آفرینش کائنات سے پہلے بھی تھا اور ہمیشہ لاشریک اور تنہا رہیگا۔ اسکی رحمتیں ہمیشہ سے جاری ہیں اور ہمیشہ جاری رہیں گی۔ وہ گورے، کالے خطاکار اور معصوم، مصری اور غیر مصری میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ ہر ذی حیات کی تمام ضروریات وہ بلا کسی تفریق کے پوری کرتا ہے۔"

---

[1] آج کل آخت اتن ـــ تل الامرنہ کے نام سے مشہور ہے۔

اور سب اس کے لطف و کرم میں برابر کے شریک ہیں۔

طہرانی نے گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے کہا کہ "اس سے قبل تاریخ انسان کے کسی مفکر نے ایسے معبود کا نظریہ نہیں پیش کیا تھا۔ چنانچہ طاقتور کاہنوں نے اس کے اس خدا کو تسلیم نہیں کیا اور اندر ہی اندر بغاوت کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ تمام سردار اور امراء اس سے برگشتہ ہو گئے۔ خاندان کے تمام افراد کی آنکھوں میں اس کے خلاف نفرت کی آگ ابل پڑی۔ اور اخناتون بالکل تنہا رہ گیا۔ صرف اسکی وفادار اور محبوب بیوی نفرتی تھی جو اپنی چھ لڑکیوں کے ساتھ آخر وقت اپنے شوہر کی غمگسار اور دمساز بنی رہی۔

اور ایک دن اچانک اخناتون پر مرگی کا شدید دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔

اخناتون کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ تمام بیٹیوں کی شادی اس کے مرنے کے بعد اسکی بیوی نے کر دی۔ البتہ اس کی ایک لڑکی "میاتن" کی شادی نہ ہو سکی۔ ماں کے مرنے کے بعد میاتن نے اپنی شادی ایک شامی تاجر سے کر لی۔ اور اس طرح ایک نئے خاندان کی بنیاد پڑ گئی۔ جس کا تعلق مصر کی شہنشاہیت سے بالکل نہ تھا۔

شہزادی زلیخا اسی "میاتن" کی نسل سے تھی اور اسی لیے بے حد خوبصورت تھی کہ اس میں شامی خون بھی شامل تھا۔ سیتی اول کے دور میں بھی زلیخا شاہی خاندان کے ہوتے ہوئے بھی شاہی خاندان

کی نہیں سمجھی جاتی تھی ۔ بظاہر اسکا کوئی ہمدرد نہ تھا ۔ فرعون کا میر عمارت اور مجسمہ ساز "حورم حب" چونکہ دل ہی دل میں باطنی طور پر اخناتون کے مذہب کا پیرو تھا اس لیے وہ زلیخا سے ہمدردی رکھتا تھا ۔ اسی "حورم حب" نے شہزادی کے مقبرہ کا نقشہ بنایا اور بذات خود مقبرہ کی تعمیر میں حصہ لیا ۔ اس لیے میرے اندازے کے بموجب مقبرہ بیحد مضبوط اور ناقابل شکن ہوگا ۔ اور اس کی کھدائی میں زیادہ وقت ضرور صرف ہوگا ۔

طہرانی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا ۔

حسن اصغر نے چاہا کہ وہ طہرانی سے کہے کہ ایک مرتبہ داخلی دروازہ کی کھدائی کے بعد وہ ایک بہترین رہبر کی حیثیت سے پوری پارٹی کو شہزادی کے سنگی تابوت تک بہ آسانی پہونچا دیگا ۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنی زبان خاموش رکھی ۔ وہ جانتا تھا کہ پارٹی کے تمام افراد اس کو مافوق الفطرت سمجھ کر اس کی طرف سے مشکوک ہیں اور اس کا یہ جملہ اس کو اور بھی زیادہ مشکوک بنا سکتا ہے اسلیئے وہ خاموش ہی رہا ۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد قافلہ پھر روانہ ہوا اور تقریباً ۱½ گھنٹے کی مسافرت کے بعد پھر اسی جگہ پہونچ گیا جہاں ۳½ ہزار برس سے ایک پتھر پر یہ تحریر نقش تھی ۔

"محو خواب جو بیدار کی جائے گی ۔"

طہرانی کے حکم پر مزدوروں نے ایک پتھر پر کھدائی کے لیے اپنا پہلا بیلچہ مارا اور کھدائی شروع ہو گئی ۔ حسن صفر کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ خود بھی کدال کے ذریعہ پتھر ہٹا رہا تھا ۔

باب ــــــــــ ۱۲

دوپہر کا کھانا کھائے بغیر پارٹی کے تمام افراد ٹیلے کے پتھروں کو ہٹاتے رہے، اور تقریباً تین بجے انھیں ایک سنگی دروازہ نظر آگیا۔ اور ہر شخص کی ہمت بڑھ گئی۔

"بس ــــ یہی وہ داخلی دروازہ ہے جس کو توڑ کر ہم مقبرہ کی اصل اندرونی عمارت میں داخل ہو جائیں گے ــــ" حسن اصغر نے چیخ کر کہا۔

"کیا تم یہ بات بالکل یقین سے کہہ رہے ہو ــــ" طہرانی نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"ہاں ــــ بالکل یقین کے ساتھ ــــ" حسن اصغر نے فوراً جواب دیا۔

"کس بنیاد پر ــــ" طہرانی کا شک بدستور باقی تھا،

"یہ ایک لمبی کہانی ہے ـــــ فی الحال میں یہی التجا کروں گا کہ میری ہر بات پر یقین کیا جائے اس لیے کہ زلیخا کی زندہ لاش تک پہونچنا صرف آپ سب کا ہی نہیں میرا بھی مقصد ہے ـــــ"۔

"لیکن کیوں ـــــ" عازم الدین نے پوچھا۔

"اس کا جواب آنے والا وقت ہی دیگا ـــــ"۔

اس مرتبہ حسن اصغر کی آواز میں لوچ اور نرمی نہ تھی، ـــــ بدلی ہوئی گرجدار آواز اور اسکی سختی نے عازم الدین اور طہرانی دونوں کو خاموش کر دیا، اور دروازہ توڑنے کے لیے مزدوروں کو اشارہ کر دیا گیا۔

شام تک کوشش ہوتی رہی لیکن حد درجہ کوشش کے باوجود دروازہ کا ایک بھی پتھر نہ توڑا جا سکا ـــــ اور کام کل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا، دوسرے دن مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ کام دوبارہ شروع ہوا ـــــ لیکن اس مرتبہ کھدائی کی نوعیت بدل دی گئی ـــــ آج مزدوروں کی ایک جماعت داخلی دروازہ کے توڑنے پر اور دوسری جماعت کوئی دوسرا دروازہ تلاش کرنے کے لیے متعین کر دی گئی ـــــ پہلی ٹولی کا نگراں طہرانی تھا اور دوسری کا حسن اصغر، ـــــ کام بڑی مستعدی سے ہوتا رہا ـــــ

حسن اصغر جس ٹولی سے کام لے رہا تھا اس نے ٹیلہ کے مغربی جانب کھدائی شروع کی تھی ـــــ سب سے پہلے منتشر پتھر ہٹائے گئے اور پھر ان پتھروں کو

توڑا گیا جو ہزاروں برس سے ایک جگہ پڑے رہنے کی وجہ سے بالکل جم کر رہ گئے تھے۔ اور جب ان پتھروں کو توڑ کر ملبہ ہٹایا گیا تو چٹان میں ایک جگہ ایک بڑا شگاف نظر آیا۔ حسن اصغر کے چہرے پر شگاف کو دیکھتے ہی مسرّت کی لہریں پھیل گئیں۔ اس نے مصری زبان میں مزدوروں کو خاموش رہنے اور اپنی جگہ کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود شگاف میں داخل ہو گیا۔

طہرانی اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو جو داخلی دروازے کو توڑنے کی جدوجہد کر رہے تھے معلوم ہی نہ تھا کہ حسن اصغر مقبرہ کی چہار دیواری میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ اپنے کام میں مشغول رہے اور حسن اصغر شگاف کے اندر اپنے قدم بڑھاتا رہا۔ تنہا لیکن دل میں حوصلوں اور امنگوں کا ایک طوفان سا چھپائے ہوئے۔

لیکن تقریباً بیس فٹ چلنے کے بعد راستہ مسدود ہو گیا۔ آگے پتھر کا ایک اور بڑا دروازہ تھا اور شگاف جس سُرنگ نما راستہ میں ہوا تھا اس کی چھت بیٹھ گئی تھی۔ کافی دیر تک حسن اصغر اس جگہ کھڑا ہو کر کھدائی کی نوعیت پر غور کرتا رہا۔ اور اس کے بعد واپس آ گیا۔

"اگر جا بجا اسی طرح عمارت کا اندرونی حصہ بیٹھ گیا ہے تو سنگی تابوت تک پہونچنا بیحد دشوار ہے۔" حسن اصغر نے سوچا اور پھر جیسے اسکا دل بھر آ گیا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ جس کمرے میں زلیخا کا تابوت رکھا ہوا ہے

اس کی بھی چھت گر گئی ہو۔" اور حسن اصغر شگاف سے باہر نکل آیا ۔۔۔ اسکا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔۔۔

اسی طرح کئی دن کام ہوتا رہا۔ سخت محنت اور مشقت کی ساعتیں گذرتی رہیں۔۔۔ گرمی سے دہکتے ہوئے دن اور خاموش ٹھنڈی راتیں ختم ہوتی رہیں۔۔۔ روشنی کی کمی اور کھنڈر کے اندر ہوا کی خرابی کی وجہ سے حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔۔۔ مزدوروں کو آرام نہیں ملا اس لیے کھدائی کے کام کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔۔۔ حسن اصغر مزدوروں کی ایک قلیل جماعت کے ساتھ اسی راستہ کو صاف کرتا رہا جہاں سرنگ کی چھت بیٹھ گئی تھی، اور ملبے کے اسی بڑے دروازے کو منہدم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔۔۔ لیکن مسلسل ایک ہفتہ کی جدوجہد کے بعد بھی کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔۔۔ سیٹی اول کے معمار "حورم حب" کے اس تعمیری شاہکار کو شکست نہ دی جا سکی اور سخت محنت و جفاکشی کے بعد بھی کوئی حوصلہ افزا بات نہ ہو سکی۔

پارٹی کا ہر شخص پریشان تھا لیکن سب سے زیادہ پریشانی حسن اصغر کو تھی۔۔۔ اور سلیم ۔۔۔ اس کی یہ حالت تھی کہ وہ گھنٹوں محویت کے عالم میں مقبرہ کے قریب کھڑا رہتا، مزدوروں کی کدالیں چلتی رہتیں، بیلچوں کی آواز بلند ہوتی رہتی، پھاوڑے پتھروں سے ٹکراتے رہتے۔۔۔ فضا میں ایک ہنگامہ سا برپا رہتا۔۔۔ سورج نکلتا۔۔۔ پھر شباب پر آتا۔۔۔ زوال پر آتا اور تاریکی کی آغوش میں سما جاتا۔۔۔ لیکن کسی کو اس کا ہوش

نہ رہتا۔ ہر ایک کی نگاہ کے سامنے صرف زلیخا تھی، اس کا سنگی تابوت تھا، اس کی ہزاروں سال پرانی نیند تھی، اس کی بیداری تھی اور وہ تجربہ تھا جس کا ارمان لیکر خاندان فراعنہ کا آخری فرعون تک اپنے تابوت میں سو گیا تھا۔

تمام رات حسن اصغر بیچین رہتا، اپنے خیمے میں ٹہلتا رہتا، سوچتا رہتا، الجھن کھاتا رہتا۔ اور پھر اپنے خیمے سے باہر آکر خلا میں گھورتا رہتا، جیسے فضا کی بلندیوں میں آسمان کی وسعتوں میں، ستاروں کی جھرمٹ میں، چاند کی رقص کرتی ہوئی کرنوں میں کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ کچھ پوچھنے کے لیے، کچھ دریافت کرنے کے لیے۔

اور اسی طرح صبح ہو جاتی۔

طہرانی عازم الدین سے کہتا "خان بہادر صاحب — پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اگر دستاویز سچی ہے، اگر مصر کی تاریخ دیانتداری کی بنیاد پر لکھی گئی ہے، اگر سیٹی اول واقعی وہ فرعون تھا جس کا تذکرہ ماضی کے گمشدہ اوراق میں ملتا ہے، اگر اس وادی میں بکھرے ہوئے پتھروں کے آنسو سچے ہیں تو ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ضرور ہوگی اور ہم نہ صرف زلیخا کے سنگی تابوت تک پہونچیں گے بلکہ اس کو بیدار بھی کریں گے۔ عازم الدین میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ مقبرہ اور اسکی آہنی دیواریں ہمارے ہی ہاتھوں سے ٹوٹیں گی۔"

ڈاکٹر بیگ تھک گیا تھا اور اس کے حوصلے تقریباً پست ہو گئے تھے

لیکن پھر بھی وہ پُر امید تھا۔ وہ کہتا "مقبرہ کے اندر زلیخا ضرور سو رہی ہے، میں سب کچھ مان سکتا ہوں لیکن یہ نہیں مان سکتا کہ ہم غلط راستہ پر چل رہے ہیں یا ماضی کی کسی گمشدہ پرچھائیں نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔"

اور بوڑھا عازم الدین ٹھنڈی سانس لیکر کہتا۔ "جب تک میرے سرہانے میں آخری پائی بھی باقی ہے یا جب تک میرے جسم میں زندگی کی آخری سانس بھی باقی ہے میں زلیخا کو بیدار کر کے رہونگا اس لیے کہ اگر زلیخا بیدار نہ ہوئی تو میرا سلیم دیوانہ ہو جائیگا۔ خدا کی قسم میں دن میں کئی بار سلیم کی آنکھوں میں زلیخا کی تصویر دیکھتا ہوں اور پھر ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے سلیم تمام رات شہزادی کی نیلی آنکھوں کے انتظار میں جاگتا رہا ہے۔"

ایک دن شام تک ناکام کھدائی کے بعد ڈاکٹر بیگ نے طہرانی سے کہا "میرا قیاس ہے کہ مقبرہ میں ایک کے بعد ایک کئی چہار دیواریاں ہونگی۔ پہلی چہار دیواری کا مغربی حصہ جس طرف حسن اصغر کھدائی کر رہا ہے گر چکا ہے۔ جس کے ملبہ نے ہمارا راستہ بند کر دیا ہے اور دوسری چہار دیواری کے پتھر اتنے بڑے ہیں کہ ہم ان کو نہیں کاٹ سکتے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔ پتھروں کو بہر حال کاٹنا ہے۔" طہرانی نے کہا۔

"کیوں نہ ہم دوسری چہار دیواری کا ایک حصہ بارود سے اڑا دیں۔" ڈاکٹر بیگ نے اچانک رائے دی،

"لیکن اس طرح اس کا بھی تو امکان ہے کہ پورا مقبرہ گر جائے اور سوتی ہوئی شہزادی دب کر ہلاک ہو جائے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب ۔ ہم شہزادی کے تابوت تک پہونچنے کیلئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور تلاش کر لیں گے ۔ ہمیں نا امید ہونیکی ضرورت نہیں ۔" طہرانی نے پوری سنجیدگی اور متانت سے کہا ۔

حسن اصغر نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا ۔ اس پر جیسے سکوت سا طاری تھا ۔ لیکن جب طہرانی نے اس سے بھی رائے مانگی تو اس نے خیمے سے باہر جاتے جاتے کہا ۔ "آج رات آپ اطمینان سے سوئیے ۔ حسن اصغر آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ کل دوپہر تک مقبرہ کا کوئی نہ کوئی دروازہ ضرور کھول دیگا ۔"

حسن اصغر یہ ڈرامائی جملہ کہہ کر خیمے سے باہر چلا گیا اور تمام لوگ ایک عالم وجود میں دیر تک حسن اصغر کے تھکے تھکے قدموں کی آواز سنتے رہے ۔

رات کے کھانے پر بھی حسن اصغر موجود نہیں تھا ، ہر شخص نے اسکی عدم موجودگی پوری شدت کے ساتھ محسوس کی لیکن کسی نے بھی ایک انجانے خوف کے تحت اس کے بارے میں عملہ کے کسی فرد سے کچھ بھی دریافت نہ کیا ۔

سب سو گئے لیکن سلیم جاگتا رہا اور صرف یہ سوچتا رہا کہ آخر اسکا یہ اجنبی مصری دوست کہاں گیا ہے ۔ حسن اصغر اس کا دوست ۔

اجنبی ہونے کے باوجود اسکا برسوں کا رفیق، مدتوں کا ساتھی،۔۔۔
چنانچہ اس کی بےچینی بڑھتی گئی حد یہ کہ وہ بھی خیمہ سے باہر نکل آیا۔
رات تاریک تھی لیکن مدھم چاند کی روشنی نے اندھیرے اجالے
کی امتزاجی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔۔۔ چند لمحات سلیم اپنے خیمہ کے
باہر کھڑا وادی کے پرحول سناٹے کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے بعد
غیرارادی طور پر ایک طرف روانہ ہو گیا، سلیم جس راستہ پر چل رہا تھا وہ
کبھی اوپر کی طرف جاتا تھا اور کبھی نیچے کی طرف، انتہائی پیچ در پیچ
اور ناہموار راستے سے گذرتا ہوا وہ آخر کار اس درّہ میں داخل
ہو گیا جو وادی میں مقبرہ سے کچھ فاصلہ پر ایک بلند چٹان پر ختم ہوتا
تھا۔۔۔ کھنڈرات کی اس وادی میں یہ چٹان کسی دیو کی کھوپڑی کی
طرح بالکل بےہموار تھی۔۔۔

سلیم نے چٹان کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دیکھا۔۔۔ چاند کی مدھم روشنی
میں دور دور تک حسن اصغر کا کوئی پتہ نہ تھا۔

حد نظر تک چاندنی رات کا منظر بےحد دلکش تھا، راستہ رات کی
تاریکی میں غائب ہو چکا تھا، ابھری ہوئی چٹانیں پہریداروں کی طرح
سر اٹھائے ہوئے کھڑی تھیں، تیز ہوا سائیں سائیں کرتی آتی ہوئی
اس طرح چل رہی تھی گویا بھوتوں کا کوئی رقص ہو رہا ہو، کھجور کے
درخت مستانہ وار جھوم رہے تھے۔۔۔ ہزاروں برس پرانی اس قدیم
میں جہاں کبھی شامی، یونانی، بابلی اور ایشیائی غلاموں نے اپنے آقاؤں

کی خوشنودی کے لیے موت کی آخری ہچکی تک کام کیا تھا اور تحریر اعمارتوں کی بنیاد رکھی تھی ـــــ دور دور تک کسی ذی روح کا پتہ نہ تھا ـــــ سلیم دیر تک زمانے کے اس بدلے ہوئے روپ کا عکس دیکھتا رہا، اور سوچتا رہا کہ اس میں اور اس سلیم میں کتنا فرق ہے جو نئی دہلی کی بارونق سڑکوں پر تنہائی کا تصور تک نہ کرتا تھا ـــــ لیکن یہاں ـــــ اس سحر زدہ وادی میں نہ تو وہ تنہائی سے ڈر رہا تھا اور نہ موت کی طرح بھیانک سناٹے سے ـــــ.

"حسن اصغر کہاں ہوگا" ـــــ سگریٹ سلگاتے سلگاتے اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور ایک مرتبہ پھر بلندی سے بستی کی گہرائیوں کی طرف نظر دوڑا دی، اچانک اس نے دیکھا کہ ایک پہاڑی پشتہ پر جو چاندنی میں چمک رہا تھا کوئی چیز رینگ رہا ہے ـــــ اور پھر ایک لمحہ بعد ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی ـــــ یقیناً یہ کوئی بے ضرر جنگلی جانور تھا ـــــ. سلیم نے یہ سوچ کر اپنی الجھنوں کو تسکین دی ـــــ اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا ـــــ.

وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ حسن اصغر کو تلاش کر کے رہیگا، چنانچہ نئے فیصلہ اور ارادے کے تحت اس نے اپنے دوست کی تلاش کے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ـــــ یہ راستہ سابقہ راستے کے مقابلہ میں بالکل مختلف تھا، اس میں جگہ بہ جگہ گہرے غاروں کا امکان تھا ـــــ کہیں زبردست ڈھلوان تھی اور کہیں ناقابل تسخیر چڑھائی ـــــ

لیکن سلیم چلتا ہی رہا۔ اور ایک ایسے پشتہ پر سے جو اُوپر سے کافی کشادہ تھا چل کر ایک ناہموار غار نما وادی میں آگیا۔ جس میں جا بجا پتھر کی جھونپڑیوں کے ویران آثار موجود تھے۔

یہاں بھی بالکل سناٹا تھا۔

اب سلیم کو خیال ہوا کہ اگر حسن اصغر نہ ملا اور وہ واپسی کے لیے راستہ بھول گیا تو اسکا کیا انجام ہوگا۔ وہ یہ بھول بھی تو گیا تھا کہ وہ کس راستے سے یہاں آیا تھا۔ چنانچہ اس نے چاہا کہ واپس جاکر مقبرہ کے نزدیک والی بلند چٹان پر کھڑے ہو کر حسن اصغر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تلاش کرے۔ لیکن ابھی اس نے واپسی کے لیے اپنا پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس نے ایک ایسی جھلک دیکھی کہ اس کے تنفس میں تیزی پیدا ہو گئی۔

سلیم کی ڈری ڈری نظروں نے دیکھا کہ وادی کے بالکل وسط میں ایک انسانی سایہ حرکت کر رہا ہے۔ ایک ایسا انسانی سایہ جو اس تنہا اور بھیانک مقام پر یقیناً اپنا خوفناک عکس ڈال رہا تھا۔ سایہ کے ساتھ ایک روشنی بھی بار بار نیچے اوپر حرکت کر رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اس کو اس سایہ پر حسن اصغر کا شبہ ہوا لیکن سایہ کی غیر معمولی جسامت دیکھ کر اسکا یہ شبہ کافور ہو گیا۔ یقیناً یہ کوئی غیر بشری قوت کا عکس ہے۔ سلیم نے سوچا اور جیسے اسکا قدم اس چٹان پر جم کے رہ گئے۔ اس نے چاہا کہ وہ واپس بھاگ جائے لیکن خود اعتمادی

ختم ہو چکی تھی اور تمام شعوری احساسات پر ایک انجانا خوف مسلط ہو چکا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ سایہ غائب ہو گیا۔

اور پھر اس کے عقب میں بہت دُور ایک آواز سی آئی، جیسے زلیخا کے مقبرہ کے بالکل قریب کسی وجود کے چلنے سے کوئی آواز پیدا ہو رہی ہو۔ سلیم نے اپنی سہمی ہوئی نظریں مقبرہ پر جما دیں۔ سلیم کی نگاہوں کے سامنے پتھر اور ریت کا ایک بہت بڑا انبار تھا۔ دائیں طرف چاند کی سبک کرنیں پھیلی ہوئی تھیں اور بائیں جانب آبنوسی اور کھجور کے درختوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اور بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ سلیم کے دماغ میں بہت سے خیالات پیدا ہوئے اور جیسے اسے پھریری سی آ گئی، ڈر اور خوف کے تحت اسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ قدموں کی آواز قریب آ گئی۔ بس تین چار منٹ کے بعد یہ سایہ چاند کی روشنی میں ہو گا۔

اور جب چاند کی روپہلی روشنی میں اس سایہ نے اپنا پہلا قدم رکھا تو سلیم کے منہ سے خوشی اور مسرت کی ایک آہ سی نکل گئی۔

چاندنی میں نہایا ہوا یہ سایہ حسن اصغر کا تھا۔

سلیم نے دیکھا کہ حسن اصغر ماحول سے بالکل بے پرواہ ہو کر زلیخا کے مقبرہ کی طرف جا رہا ہے۔ چٹان سے آہستہ آہستہ اتر کر سلیم بھی وہاں پہونچا اور اپنے دوست سے تقریباً ۵ گز کے فاصلہ پر ایک پتھر کی

آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ حسن اصغر یہاں رات کی تنہائی میں کیا کرنے آیا ہے۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے چاند کی مدھم روشنی میں حسن اصغر نے زلیخا کے مقبرہ کی طرف منہ کر کے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور کہا۔

"اے اخناتون کی آخری وارث۔ اے احمس کی محبوبہ۔ اے ہزاروں سال سے سونے والی مصری شہزادی۔ دیکھ کہ آج تیرے دروازہ پر وہ آیا ہے جو آخری وقت تک تیرا سچا ہمدرد تھا۔"

اب حسن اصغر کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے تیز آواز میں کہا۔

"شہزادی زلیخا۔ تیرا آخری دوست گیتا ری تیرے دروازہ پر کھڑا تجھے پکار رہا ہے۔ مجھے پہچان۔ میں گیتا ری ہوں۔ تیرا رفیق اور تیرے محبوب کا دوست۔ رب حقیقی کی قسم۔ تو ہزاروں سال سے سو رہی ہے اور میں ہزاروں سال سے جاگ رہا ہوں۔ اس لیے میری برسوں کی ریاضت کو خاک میں نہ ملا۔ باہر آ۔ مجھے تجھ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

زلیخا۔ تو خوب جانتی ہے کہ ماضی میں۔ گیتا ری نے خواہ اس کا کوئی بھی نام رہا ہو تجھے کبھی نہیں پکارا۔ تو بھی اپنے نجات دہندہ کا انتظار کرتی رہی اور میں بھی۔ لیکن آج مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔ خدا کی قسم میری عقل حیران ہے کہ تیرے مقبرہ کے جن اندرونی راستوں سے میں سینکڑوں مرتبہ گزر چکا ہوں۔ وہ میرے لیے نئے

کیسے بن گئے؟ — وہ راستے جو ہمیشہ میرے لیے کھلے رہے آج بند کیسے ہو گئے؟ —

اس لیے زلیخا — باہر آ — اور مجھے بتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، دیوار کے نہ ٹوٹنے کا سبب کیا ہے — کدالوں کی ناکامی کا راز کیا ہے — ؟

زلیخا — تجھے آسمان پر چمکنے والی محبت کی دیوی عشتار[1] کی قسم تجھے رب السموات آنو کی قسم — تجھے دیوتا انلیل[2] کی قسم — تجھے طاقت کے دیوتا آیا کی قسم — تجھے "شرگم" کا واسطہ — باہر آ — اس لیے کہ مسلسل ناکامی میرا دل توڑے دے رہی ہے۔

زلیخا — تاریخ کے صفحات میں لکھا ہو یا نہ لکھا ہو — لیکن میں جانتا ہوں کہ یا تو خدائے آفتاب کی بیٹی عشتار نے "ادزپرس" سے محبت کی اور یا پھر تو نے احمس سے — میں تیری دوشیزگی اور اس کی پاکیزگی کی قسم کھا سکتا ہوں — اس لیے اپنے اس پرانے رفیق کی مدد کر اور مجھے بتا کہ میں تیرے تابوت تک پہنچنے میں کیوں ناکام ہو رہا ہوں —

زلیخا — تجھے دیوی آرسس[3] کا واسطہ — باہر آ — اس لیے کہ

---

[1] عشتار — زہرہ کا مصری نام ہے، جس کو مادر عظیم کہا جاتا ہے۔

[2] انلیل — مصریوں کا رب الارض و فضاء تھا۔

[3] آرسس — مصریوں کی سب سے مقدس دیوی تھی۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ (صفحہ ۱۴۴ پر دیکھیے)

میں تجھے پکار رہا ہوں ــــ میں گیتاری ــــ احمس کا دوست ــــ"

اور پھر سلیم نے دیکھا کہ مقبرہ کی باہری دیوار پر ایک سفید دھبّہ ابھرا اور اس دھبہ نے دھیرے دھیرے ایک انسانی شکل اختیار کرلی ــــ۔ اب زلیخا حسن اصغر کے بالکل سامنے کھڑی تھی، وہی نیلی آنکھیں ــــ ویسا ہی سفید لباس ــــ مرمریں گلے میں سونے کا ویسا ہی سانپ ــــ

"میں آگئی گیتاری ــــ میں آگئی ــــ"

"میں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی ــــ جس طرح مجھے یہ یقین ہے کہ تم اپنی ہزاروں سال کی نیند سے بیدار ضرور ہو گی"

"گیتاری ــــ اے میرے مونس و ہمدرد مجھے معلوم ہے کہ آج تم کتنا پریشان ہو اور یہاں آنے سے قبل تم نے کس طرح اخناتون کے بنائے ہوئے ایک خدا کی پوجا والے مندر میں کس طرح اپنی کامیابی کی دعا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳) عالم ارواح میں یہ اوزیرس کے دوش بدوش صدارت کے فرائض انجام دیتی ہے، طوفان عظیم ــــ یعنی طوفان نوح کی مصری حکایت میں ہاتھور کی حیثیت سے انسانوں کو تباہ کرتی ملتی ہے ــــ قدیم مصری دیومالا میں اس کے متعلق ایک دلچسپ کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ پہلے یہ زمین پر رہا کرتی تھی، ایک روز اسے آسمان پر جاکر بس جانے کی سوجھی اور یہ بوڑھے دیوتا "را" کا خفیہ نام معلوم کیے بغیر ممکن نہ تھا چنانچہ اس نے ایک سانپ بن کر را کو ڈسا۔ "را" بہت مضطرب ہوا تو اس نے زہر اتارنے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ وہ اپنا خفیہ نام بتلادے ــــ مجبوراً را کو بتلانا پڑا اور اس طرح اس نے آسمان کو اپنا مسکن بنا لیا۔

مانگی تھی ۔۔۔ لیکن گیتاری ۔۔۔ میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتی اس لیے کہ اسپاتا کی خبیث روح ہمارے راستہ میں حائل ہے، اس نے اپنی خباثت کے بل پر مقبرہ کی دیواروں کو ڈھا دیا ہے ۔۔۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ میں بیدار ہو کر احمس سے ملوں ۔۔۔"

"پھر میں کیا کروں شہزادی ۔۔۔"

"اسپاتا کا جسم برباد کر دو ۔۔۔ اس کے بعد وہ حشر تک کے لیے ہمارے راستہ سے ہٹ جائیگا ۔۔۔ اور گیتاری تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اسکی ممیائی شدہ لاش کہاں رکھی ہوئی ہے ۔۔۔"

"میں سمجھ گیا زلیخا ۔۔۔ اے کاش یہ راز مجھے پہلے ہی دن معلوم ہو جاتا تو اتنی بھی تاخیر کیوں ہوتی ۔۔۔"

"پھر میں جا رہی ہوں گیتاری ۔۔۔ اخناتون کی قسم، میں تھک چکی ہوں ہزارہا برس کی نیند نے میرا جسم توڑ کے رکھ دیا ہے ۔۔۔"

"اور پھر سلیم کے دیکھتے ہی دیکھتے اسکی محبوبہ کی پرچھائیں غائب ہو گئی، حسن اصغر چند منٹ تک محویت کے عالم میں کھڑا رہا اور اس کے بعد تیز تیز قدموں کے ساتھ ایک انجانی سمت کی طرف روانہ ہو گیا ۔۔۔

سلیم بھی اسکا تعاقب کرتا رہا۔

متعدد پیچ در پیچ راستوں اور کھنڈروں سے گذرنے کے بعد حسن اصغر ایک بوسیدہ عمارت کے کھنڈروں کے پاس جا کر رک گیا ۔۔۔ سلیم نے دیکھا کہ کھنڈر کے مسمار شدہ پھاٹک کے ملبہ پر ایک اور سایہ موجود تھا۔

اچانک فضا میں ایک غیم انسانی آواز بلند ہوئی ۔

"گیتاری ـــ وہیں رک جاؤ ـــ یہ میں ہوں اسپاتا"

"لیکن کیوں رک جاؤں ـــ" گیتاری کی آواز میں بالکل نیا عزم تھا

"اس لیے کہ میں اپنے جسم کی بربادی نہیں چاہتا ـــ مجھے اچھی طرح اچھی طرح معلوم ہے کہ شہزادی نے تمھیں میرا یہ راز بتا دیا ہے کہ میں اس کے مقبرہ کے چاروں طرف ایک آہنی حصار کھینچ چکا ہوں اور وہ اسی صورت میں ٹوٹ سکتا ہے جب میرا جسم برباد کر دیا جائے ـــ"

"ہاں ـــ اور تم جانتے ہو کہ تمھارا جسم برباد کرنے کی قوت مجھ میں موجود ہے ـــ" گیتاری نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"معلوم ہے ـــ لیکن گیتاری ـــ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں صلح کر لیں ـــ"

"میں مکر و خبیث اور شیطان روحوں سے صلح کا قائل نہیں ـــ"

"لیکن گیتاری ـــ ذرا سوچو ـــ زلیخا میری قانونی منگیتر ہے، سیٹی اول نے فرعون زماں کی حیثیت سے میری اور اسکی منگنی کر دی تھی، قانوناً اور اخلاقاً وہ میری ہو چکی تھی اور آج بھی ہے ـــ پھر میں اسے کیسے کسی دوسرے کے حوالے کر دوں"

"میں بحث میں اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا اسپاتا ـــ زلیخا کی بیداری میری زندگی کا مقصد ہے اور میں اس مقصد کو حاصل کر کے رہوں گا ـــ"

"یعنی میرا جسم ضرور برباد کر دو گے ۔" اب اسپاتا کے لہجے میں لجاجت تھی ۔

"ہاں ۔ یہ میرا فیصلہ ہے ۔ کیونکہ مجھے یہ راز معلوم ہو چکا ہے ۔"

"نہیں گیتا ری ۔ نہیں ۔ تمھیں رب رار کی قسم ۔" اسپاتا کی روح بھیک مانگنے کے انداز میں چیخ اٹھی ،

"رب رار کی قسم بیکار ہے اسپاتا ۔ تمھارا رب جہالت کی تاریکیوں میں گم ہو چکا ہے اور دنیا جان چکی ہے کہ ماضی میں جو تمھارا رب تھا وہ صرف سورج ہے آسمان کا ایک طاقتور ستارہ ۔ بس چند منٹ کی مہلت اور ہے اس کے بعد میں تمھاری ممی کے نزدیک پہونچ جاؤں گا اور ۔ پھر ۔"

"نہیں ۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ تمھیں اپنا منصف بنا کر انصاف کر لوں ۔"

"لیکن میں تمھارا منصف بننے کے لیے تیار نہیں ہوں ۔"

"نہ بنو ۔ لیکن ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ قانوناً اور اخلاقاً زلیخا میری ہے یا نہیں ۔"

"محبت اور محبت کے جذبات قانون اور اخلاق کی ترازو میں نہیں تولے جاتے اسپاتا ، اس کے سودے کا تعلق دل سے ہے اور دل جس کا ایک مرتبہ ہو جاتا ہے پھر دوسرے کا نہیں ہوتا ۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تمھاری منگنی سے قبل زلیخا ۔ احمس کی نہیں تھی ؟"

"خیر ــــ تم رفاقت اور دوستی کے جذبہ میں ڈوب کر اخلاق اور قانون تک کی قدروں تک کو بھولے جا رہے ہو گیتاری ــــ لیکن یاد رکھو اس دنیا کا نظام اسی وقت تک چلے گا جب تک لوگ قانون اور اخلاق کی حدوں کا احترام کریں گے ــ آج تمھیں محض اس لیے کہ تم میری روح سے زیادہ طاقتور ہو اسکا پورا حق حاصل ہے کہ تم میرے جسم کو برباد کرنیکی دھمکی دے کر مجھ سے میری منگیتر چھین لو ــــ لیکن میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ تم ایسا ضرور کرو ــ میرا نام بھی اسپاتا ہے گیتاری ــــ جاؤ اپنا جسم بچانے کی خاطر میں اپنا سحر ختم کر رہا ہوں ــ زلیخا کے مقبرہ کے چاروں طرف میں نے جو آہنی حصار کھینچ دیا تھا وہ کل صبح تک موم کی طرح پگھل جائیگا ــ اور تم مقبرہ کا دروازہ توڑنے میں کامیاب ہو جاؤ گے ــ میں جانتا ہوں کہ تم شہزادی زلیخا کو بیدار بھی کر لو گے ــــ لیکن اس کے بعد مجھے دیکھنا ہے کہ تم زلیخا کو احمس کے حوالے کیسے کرو گے ــــ؟ اور یہ کہہ کر اسپاتا کی روح نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا ــــ دیر تک اس لرزا دینے والے قہقہے کی صدائے بازگشت فضا میں گونجتی رہی ــــ حسن اصغر دم بخود کھڑا رہا اور اس کے بعد وہ ٹھیک اسی جگہ آگیا جہاں سلیم پتھر کی آڑ میں کھڑا ہوا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا ــــ

سلیم اور حسن اصغر کی نظریں چار ہوئیں ــ ایک مشفقانہ مسکراہٹ حسن اصغر کے لبوں پر پھیلی اور اس نے سلیم کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر

کہا۔ "کہانی ختم ہونے والی ہے سلیم اس لیے میں نے خود چاہا تھا کہ تم میری اور اسپاتا کی تمام گفتگو اپنے کانوں سے سن لو۔ میں اب کوئی بات راز رکھنا نہیں چاہتا۔ میں واقعی گیتاری ہوں۔ تمھاری مصری زندگی کا آخری رفیق۔ مجھ میں اور تمھارے وجود میں فرق صرف اتنا ہے کہ تم نہیں جانتے تھے کہ تم خان بہادر عازم الدین کے بیٹے کے علاوہ احمس بھی ہو اور میں اپنی پیدائش کے وقت بھی جانتا تھا کہ میں گیتاری ہوں۔ اس لیے کہ میں زلیخا کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر عین اس وقت جبکہ وہ زندہ ممی بنا کر اپنے تابوت میں لٹائی جا رہی تھی قسم کھائی تھی کہ میں نہ صرف زلیخا کو بیدار کر کے رہوں گا بلکہ اس کو اس کے محبوب سے بھی ملاؤں گا۔

۳½ ہزار سال گذر گئے میری اس قسم کو۔ میں پیدا ہوتا رہا اور مرتا رہا۔ اور سلیم۔ تمھیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ سینکڑوں دفعہ پیدا ہونے اور مرنے کے بعد بھی میری شکل و صورت، خدوخال اور قد و قامت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اور میں آج بھی بالکل وہی ہوں جو آج سے ۳½ ہزار سال قبل فرعون سیتی کے دور حکومت میں تھا۔ میں جانتا ہوں تمھیں میری بات سن کر حیرت ہو رہی ہو گی لیکن سلیم یہ عالمِ ارواح، قوت ارادی اور علوم باطنی کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے جس کی نظر میں نہ زندگی ہے نہ موت، نہ ماضی ہے نہ مستقبل۔ نہ زمین ہے نہ آسمان۔ اور نہ جس پر گذرتے ہوئے وقت کا کوئی اثر پڑتا ہے۔

تم یوں سمجھ لو کہ دنیا کے نزدیک سیتی اول کے دورِ حکومت کو ۳½ ہزار سال گذر چکے ہیں لیکن چشمِ باطنی کے نزدیک یہ طویل مدت ایک لمحہ سے بھی کم ہے۔ بہرحال یہ ایک الجھا ہوا فلسفہ ہے جو میں یہاں چند منٹ میں تمھیں سمجھا نہیں سکتا لیکن اس فلسفہ کا زندہ ثبوت میں تمھیں دکھا ضرور رہا ہوں۔ اور یہ ثبوت خود میرا وجود ہے ـــ جو تمھاری نگاہ میں حسنِ اصغر تھا ـــ لیکن ہے وہ گیتاری ـــ

سلیم ـــ تمھیں یاد ہوگا کہ جب ہم نے تغلق آباد کے کھنڈروں کی ایک برجی پر سب سے پہلے زلیخا کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی تو داستہ میں ہم کو ایک ایسا انسان بھی ملا تھا جو مصری لباس میں ملبوس تھا ـــ ہم جانتے ہو وہ انسان کون تھا ـــ وہ میں تھا

سلیم ـــ آج کا حسنِ اصغر اور گذرے ہوئے ماضی کا گیتاری ـــ جس کے نزدیک نہ وقت کی کوئی مدت ہے اور نہ نام کے کوئی معنی ـــ وقت کم ہے سلیم ورنہ میں تمھیں تفصیل سے بتاتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ـــ قاہرہ کی سڑکوں پر پھرنے والا حسنِ اصغر تغلق آباد کے کھنڈروں میں کیسے پہونچا اور زلیخا نے تمھیں اپنی جھلک دکھا کر تمھیں اپنی طرف راغب کیسے کیا ـــ؟

سلیم ـــ میرے دوست ـــ وہ وقت بہرحال آگیا جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا ـــ تم اطمینان رکھو ـــ کل دوپہر تک زلیخا کے مقبرہ کا ہر دروازہ کھل جائیگا، ہم دونوں اسکے تابوت کے

پاس ضرور موجود ہوں گے ۔ اور پھر آج کا مورخ اپنی آنکھ سے دیکھ لیگا کہ اگر ایک طرف محبت کی ماری ہوئی عورت کا جسم حکمت کے اصولوں پر ہزاروں سال تک زندہ رہا تو دوسری جانب ایک انسان کی روح بھی محض اپنی قوت ارادی کے بل پر علم الارواح کے سہارے ہزاروں سال تک ایک ہی جسم کو اپنا مسکن بنائے رہی ۔

تم اسپاتا کی خباثت سے بھی مطمئن رہو ۔ وہ مجھے چیلنج دے کر گیا ہے کہ زلیخا بیداری کے بعد بھی اجس یعنی سلیم کی نہیں ہو سکتی لیکن وہ یہ بھول گیا ہے کہ اس کے مقاصد بُرے اور میرے مقاصد نیک ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ نیکی اور بدی کی اس لڑائی میں فتح بہر حال نیکی کی ہی ہو گی ، ۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اسپاتا کو فنا نہیں کر سکتا لیکن میں اسپاتا کو اس قابل بھی نہیں رکھونگا کہ وہ تمھیں یا شہزادی کو کوئی نقصان پہونچا سکے ۔"

حسن اصغر ابھی کچھ اور کہتا کہ اسے دور سے روشنی نظر آئی ۔ چنانچہ اس نے اپنی گفتگو نامکمل ہی ختم کر دی اور حیران و مبہوت سلیم سے کہا ۔ "وہ دیکھو تمھارے والد اپنے دوستوں کے ساتھ تمھیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک چلے آئے ۔ اس لیے آؤ ۔ چلیں ۔ ورنہ وہ زیادہ پریشان ہو جائینگے ۔ چلتے چلتے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ تم آج رات کی کوئی بات کسی سے نہ کہنا ۔"

باب ـــــــــ ۱۳

واپسی پر دونوں کی ملاقات عازم الدین اور ان کے ساتھیوں سے ہوگئی ۔۔۔ عازم الدین کافی گھبرائے ہوئے تھے ۔۔۔ طہرانی کے پوچھنے پر سلیم نے بتایا کہ وہ اور حسن اصغر دونوں مل کر زلیخا کے مقبرہ کی پُرسکون جانچ پڑتال کر رہے تھے ۔۔۔

سلیم کے اس جواب نے طہرانی کے علاوہ سب کو مطمئن کر دیا ۔۔۔ جواب سن کر طہرانی نے حسن اصغر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ایک انجانی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی اور وہ گردن جھکا کر ایک طرف چل دیا ۔۔۔

اگر اس مسکراہٹ کی کوئی زبان ہوتی تو یقیناً ہر شخص سن لیتا کہ طہرانی کی مسکراہٹ نے چیخ چیخ کر کہا تھا ۔۔۔ "کوئی جانے یا نہ جانے حسن اصغر ۔۔۔ لیکن میں خوب سمجھ رہا ہوں کہ تم کہاں گئے تھے ۔۔۔ اور سلیم تمہارے ساتھ

کیوں تھا ــــ اس لیے کہ میں نے اپنے بال دھوپ میں نہیں ــــ مصر کے ان ہی کھنڈرات اور اس کے ماضی کے اسرار کی عقدہ کشائیوں میں سفید کیے ہیں ــــ"

یہ رات بھی سلیم کو جاگتے ہی گذری ــــ تمام رات وہ زلیخا کے تصور میں ڈوبا رہا اور ایسا محسوس کرتا رہا جیسے اس کے دماغ کے تاریک گوشے بتدریج روشن ہو رہے ہیں ــــ وہ کچھ بھول رہا ہے ــــ اسے کچھ یاد آ رہا ہے، ــــ ماضی کے پردے چاک ہو رہے ہیں، تاریکی میں روشنی ابھر رہی ہے ــــ کوئی چیز اس کے ذہن کی موٹی دیواروں میں شگاف ڈال رہی ہے ــــ جیسے کوئی شے اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی ہے اور جا رہی ہے ــــ کبھی اندھیرا ہو رہا ہے، کبھی اجالا ہو رہا ہے ــــ سورج نکل رہا ہے ــــ سورج غروب ہو رہا ہے، ــــ چاند بڑھ رہا ہے ــــ چاند گھٹ رہا ہے، ــــ بہار آ رہی ہے ــــ بہار جا رہی ہے ــــ اور پھر جیسے بالکل اچانک اسے سب کچھ یاد آ گیا ــــ وہ چیخ پڑا ــــ "ہاں ــــ میں احمس ہوں، ــــ میں بالائی مصر کی خانہ جنگی میں مارا گیا تھا ــــ زلیخا میری محبوبہ تھی، گیتاری میرا دوست تھا، "حطشی" میری ماں تھی "خوتوتی" میرا باپ تھا ــــ اور یہ میں تھا جس نے مصر کو "ہائیکوس" کی بغاوتوں سے نجات دلائی تھی۔"

ماضی کے گہرے نقوش یاد آتے ہی سلیم کے چہرے پر سکون و اطمینان کی لہریں پھیل گئیں ــــ اب اسے کوئی الجھن نہ تھی ــــ اسکی سوئی ہوئی

قوت بیدار ہو چکی تھی، اسے یاد آ چکا تھا کہ اسکا شمار مصر کے بہادر ترین آدمیوں میں سے ایک تھا، اور اسکا خاندان ملک کا ایک خوشحال اور مہذب خاندان سمجھا جاتا تھا۔

دھیرے دھیرے سلیم کو یاد آیا کہ زلیخا اور وہ ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے۔ بچپن کی گہری اور مخلصانہ محبت جو بتدریج ایک جوان محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور پھر سلیم کو اپنی محبت کا ایک رنگین واقعہ یاد آ گیا۔

شام گہری اور تاریک تھی، افق پر کالے بادل چھا رہے تھے، ساری کائنات پر ایک رومان انگیز سناٹا طاری تھا اور زلیخا دریا کی طرح سفید لباس میں اس کے ساتھ شہر کے باہر ایک باغ میں ٹہل رہی تھی، اچانک بادل گرجے اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ دونوں نے دوڑ کر ایک درخت کے نیچے پناہ لی۔ اس طرح کا دونوں کا جسم ایک دوسرے سے ملا ہوا تھا۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا جس کی وجہ سے زلیخا نے کہا "احمس۔ مجھے گھر پہونچا دو۔ میری والدہ بیحد پریشان ہو رہی ہونگی کیونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ میں اتنی رات گئے گھر سے باہر رہی ہوں۔" اور یہ کہہ کر جب اس نے احمس کی طرف دیکھا تو اسکی آنکھوں سے دوشیزگی کا معصوم خوف جھلک رہا تھا، ایک ایسا خوف جس میں محبت کے پاکیزہ اور معطر جذبات بھی ملے ہوئے تھے۔

اور جواب میں احمس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے

بھیگے ہوئے چہرے کو تھام کر کہا ــــ "زلیخا ــــ تم میری زندگی ہو ــــ اور جب تم میری ہو تو تمھیں دنیا کی کسی قوت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ــ شمالی جنگ سے واپس ہوتے ہی میں تم سے شادی کرونگا ــــ"

"اور تم کب واپس آؤ گے ــــ"

"جب یہ جنگ فتح کی صورت میں ختم ہو گی ــــ"

"اور اگر نہ ختم ہوئی تو ــــ" بادل اور زور سے گرجے۔

"تو تمھیں میرا انتظار کرنا پڑیگا ــــ" احمس نے زلیخا کا سر اپنے دھڑکتے ہوئے سینہ پر رکھکر کہا۔

اسی طرح رات بہت زیادہ بیت گئی،

اور جب بارش کے پانی سے شرابور دونوں گھر کی طرف روانہ ہوئے تو گویا بارش کی پہلی بوند کی طرح دونوں پاکیزہ اور کنوارے تھے لیکن دونوں کی روحیں ایک دوسرے میں ضم ہو چکی تھیں ــــ ایک عجیب سا احساس دونوں کی روح کی گہرائیوں میں اپنا نقش چھوڑ گیا تھا ــــ کسی انجانے تصور سے زلیخا کے رخسار دہکتے ہوئے انگارے بن گئے تھے اور اسکی نیلی آنکھوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک شوخ لیکن شرمیلی مسکراہٹ نے جنم لے لیا تھا ــــ

ایک ٹھنڈی سانس لیکر جب سلیم نے خیمہ کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو صبح کی روشنی پھیل رہی تھی، آس پاس کے خیموں میں زندگی انگڑائی لے رہی تھی، کھدائی کرنے والے مزدوروں کی باتیں چیت کی آوازیں فضا

میں پھیل رہی تھیں، آج سلیم اداس نہ تھا، مضمحل نہ تھا، بےچین نہ تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ آج دوپہر تک زلیخا کا مقبرہ کھول لیا جائیگا۔

ایک طویل اور فاتحانہ انگڑائی لیکر سلیم بھی خیمے کے باہر آگیا۔ سامنے کچھ فاصلہ پر زلیخا کے مقبرہ کے بالائی حصّہ پر سورج کی پہلی کرن کا رقص ہو رہا تھا،

ایک گھنٹہ کے اندر ہی تمام افراد مقبرہ پہونچ گئے۔

کھدائی شروع ہوگئی۔ طہرانی اور حسن اصغر کی ٹولیاں الگ الگ کام کر رہی تھیں، حسن اصغر زیادہ جوش اور انہماک سے کام کر رہا تھا۔ سنگین دیوار کے بڑے پتھر پر مسلسل چوٹ پڑ رہی تھی۔

اچانک ایک مزدور چیخا۔ "پتھر میں دراڑ پڑ گئی صاحب۔"

اب سب مل کر اس دراڑ کو ایک چوڑی شگاف بنا دو۔ کدالوں کے بجائے چھینیو اور ہتھوڑوں سے کام لو۔ ایک لمحہ برباد نہ کرو۔" حسن اصغر نے چیخ کر تمام مزدوروں کو ہدایت کی۔ پلک جھپکتے میں طہرانی والی پارٹی کو بھی اس دراڑ کی اطلاع پہونچ گئی سب یہاں جمع ہو گئے۔ اور کام میں شدت آگئی،

دوپہر تک پتھر میں اتنا بڑا شگاف بنا لیا گیا کہ ایک آدمی اس میں داخل ہو سکتا تھا۔ حسن اصغر نے کہا۔ "سب سے پہلے میں اس میں داخل ہونگا۔" حسن اصغر نہ کہتا تب بھی پارٹی کے کسی فرد میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس شگاف میں داخل ہوتا۔

اللہ کا نام لیکر ایک نئے عزم، آہنی ارادے اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ حسن اصغر اس شگاف میں داخل ہو گیا۔

یہ لمحات ہر ایک کے لیے انتہائی صبر آزما تھے۔ "اندر زہریلی گیس بھی تو ہو سکتی ہے۔" ڈاکٹر بیگ نے دل ہی دل میں کہا۔ اور اپنی نگاہیں شگاف پر مرکوز کر دیں۔

اور سلیم یہ سوچ رہا تھا۔ "اسپاتا نے آخر کار اپنا سحر واپس ہی لے لیا ورنہ ناممکن ہے کہ یہ پتھر ٹوٹتا۔"

چند منٹ کے بعد پسینہ میں شرابور حسن اصغر واپس آیا۔ سوالیہ اور بیتاب نظروں سے ہر شخص نے اسکی طرف دیکھا۔ "بیس فٹ تک راستہ صاف ہے لیکن اس کے بعد ملبہ نے راستہ مسدود کر دیا ہے۔ ہوا بالکل صاف ہے، اس لیے مرد اس میں داخل ہو کر ملبہ ہٹا سکتے ہیں۔" حسن اصغر نے سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نے اور کیا دیکھا۔" طرانی نے بیچینی سے پوچھا۔

"ملبہ ہٹ جائے تو ایک لمبا راستہ ملے گا، اور اگر کوئی اور دروازہ نہ ہوا تو چند گھنٹوں سے گزرنے کے بعد ہم خود کو شہزادی زلیخا کی آرام گاہ میں پائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ملبہ صاف کر لیا جائے تو شام سے قبل ہی ہمیں ہمارا مقصد حاصل ہو جائیگا۔"

اور جیسے حسن اصغر کے اس جملے نے پارٹی کے تمام افراد کے پژمردہ چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

تین بجے بجے مزدوروں نے ملبہ ہٹا دیا۔ شگاف سے جھانکنے پر پتہ چلا کہ اب راستہ بالکل صاف ہے۔ سب سے پہلے حسن اصغر اور اس کے بعد دیگر تمام افراد ہاتھ میں لالٹینیں لیکر شگاف میں داخل ہو گئے۔

اندر مسجد و محرابیں تھیں اور کھلے ہوئے دروازے تھے۔ ہر شخص کا دل آنے والے خطرات کے تصور سے دھڑک رہا تھا لیکن حسن اصغر بالکل پرسکون تھا۔ جلد ہی وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پہونچ گئے۔ جو بالکل سادہ اور نقش و نگار سے بالکل خالی تھا۔ دائیں جانب ایک دروازہ تھا اور اسمیں داخل ہونے کے بعد ایک سُرنگ نما راستہ۔ سرنگ میں بے انتہا گرمی تھی، دم گھٹتا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود سب اس میں داخل ہو گئے۔ راستہ ڈھلوان تھا۔ حسن اصغر نے کہا۔ "غالباً ہمیں یہ سرنگ کسی تہ خانے میں لیجائیگی۔" اور واقعی تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد وہ ایک چوکور کمرے میں پہونچ گئے۔ جو چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا، کمرے کی اونچائی تقریباً نو فٹ تھی۔ کمرے میں کوئی سامان نہ تھا۔ حسن اصغر اور طہرانی نے روشنی کی مدد سے تمام دیواروں کو دیکھا۔ بائیں جانب کی دیوار میں ایک آہنی چرخی لگی ہوئی تھی۔ حسن اصغر نے یہ چرخی پوری قوت سے گھمائی۔ اور ایک گھن گرج آواز کے ساتھ دیوار کا ایک پتھر ہٹ گیا۔ اب ایک اور تاریک راستہ تھا۔

ایک ایک کر کے دھڑکتے ہوئے دلوں اور متجسس نگاہوں کے ساتھ

تمام افراد اس راستہ میں داخل ہوئے۔ چند قدموں کے بعد یہ راستہ ایک محراب نما دروازہ پر ختم ہوا۔ اور جب سب اس دروازہ سے ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئے تو۔ عازم الدین کے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

ہال کے وسط میں ایک بڑے گلابی پتھر کے چبوترے پر ایک تابوت رکھا ہوا تھا۔ ایک ایسا تابوت جس کو یقیناً انسانی ہاتھوں نے صدیوں سے نہیں چھوا تھا۔

کمرے کی دیواروں پر بیحد صفائی سے روغن کیا ہوا تھا، خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ تابوت کے قریب ایک سنگی تپائی رکھی ہوئی تھی اور اس پر نقش تھا۔ "شہزادی زلیخا اس تابوت میں سو رہی ہے۔" اور جب طہرانی نے تابوت کے سرہانے روشنی ڈالی تو اس پر قدیم مصری زبان میں نقش تھا۔

"سونے والی جسے بیدار کیا جائیگا۔"

حسن اصغر اور سلیم کے علاوہ ہر ایک کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کامیابی اتنی جلد ان کے قدم چومیگی اور نئی دہلی کے ایک کمرے میں بیٹھکر محض ایک قدیم دستاویز کے سہارے انھوں نے جو خواب دیکھا تھا وہ ایک زندہ اور روشن حقیقت بن کر انکے سامنے آجائے گا۔

تابوت کا ڈھکن بند تھا۔ اور ہر شخص خاموش تھا۔ اسی

تابوت کے اندر زلیخا سو رہی ہے ـــ ۳½ ہزار سال سے سو رہی ہے ،
سیٹی اوّل کے ایک بھیانک تجربہ کے تحت مسلسل سو رہی ہے ، ـــ سو رہی ہے
اور اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہے ـــ .

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ شہزادی مر چکی ہو اور تابوت کے اندر
ہمیں اسکی لاش ملے ـــ" ڈاکٹر بیگ نے دل ہی دل میں سوچا ـــ .

"آج کا کام ختم ہوا آقائے طہرانی ـــ اب کل دن میں شہزادی کا
تابوت کھولا جائیگا ـــ" حسن صفر نے مضبوط آواز سے کہا ـــ
اور کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ سب مقبرہ کے باہر نکل آئے ـــ

—— o ——— ✕ ——— o ——

باب ـــــــــ ۱۴

فتح کی یہ رات واقعی بہت حسین تھی،

پارٹی کے تمام افراد مسرور تھے ـــ ایک ناممکن بات ممکن ہو چکی تھی،

ـــ طہرانی بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا ـــ پروفیسر اور ڈاکٹر بیگ بھی بیحد خوش تھے، ـــ اور عازم الدین کی تو خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا،

لیکن شاید ابھی قدرت کو ان کی مکمل خوشی منظور نہ تھی،

خیمہ کا پردہ اٹھا ـــ اور حسن اصغر نے جو غالباً دور سے دوڑتا ہوا آ رہا تھا طہرانی کو تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا ـــ "ابھی ابھی مجھے خبر ملی ہے کہ ہوّارہ کے عربوں کی ایک بڑی جماعت قبیلہ حمّام کے شیخ کی سرکردگی میں انخارجہ سے روانہ ہوئی ہے اور ان کا رخ اسی وادی کی طرف ہے ـــ"

"لیکن ان کے آنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے ـــ" عازم الدین نے

گھبرا کر کہا۔

"ان کو خفیہ طور پر اطلاع ملی ہے کہ مالدار ہندوستانیوں کی ایک جماعت کسی مدفون خزانہ کی تلاش میں اسی وادی میں قیام پذیر ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہم سب کو لوٹنا چاہتے ہونگے۔" حسن اصغر نے کہا۔

"پھر کیا ہوگا ۔۔۔؟" ڈاکٹر بیگ تقریباً بوکھلا گئے۔

"افسوس صرف اسکا ہے کہ خود ہم نے مصلحتاً اور ضرورتاً حکومت کو اپنی آمد کا مقصد غلط بتایا تھا ۔۔۔ جس کی وجہ سے ہم پولیس کی کوئی مدد بھی نہیں لے سکتے اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے کہ ہم بذات خود ان حملہ آور عربوں کا مقابلہ کریں۔"

"لیکن یہ عرب بھی تو باقاعدہ مسلح ہونگے۔" طہرانی نے کہا۔

"ہاں لیکن ان کی بندوقیں توڑے دار پرانی ساخت کی ہیں، اور ہم جدید آتشین اسلحہ سے مسلح ہیں۔ اس لیے مقابلہ زیادہ دشوار نہ ہوگا" ۔۔۔ حسن اصغر نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"تو ۔۔۔ تیاری کی جائے، ہم ہر قیمت پر ان کا مقابلہ کریں گے۔" یہ سلیم کی آواز تھی،

"تم یہاں تیاری کرو اور میں مقبرہ کا بڑا شگاف بند کرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ حملہ آور عرب اسمیں داخل ہو جائیں اور شہزادی کے تابوت کو نقصان پہونچ جائے۔" حسن اصغر جملہ ختم کرتے ہی خیمہ سے باہر نکل گیا۔ اور طہرانی نے کہا۔ "حسن اصغر نکسر کے بڑے بوڑھے واقعی ٹھیک کہتے

تھے ۔ تم واقعی مرد عاقل ہو اور تم میں حقیقتاً کوئی نیک لیکن بجید پرانی روح حلول کر گئی ہے ۔" طہرانی نے زیر لب کہا۔

مقابلہ کی تیاری ہونے لگی ۔ تمام مزدور بھی بندوقوں سے مسلح کر دیئے گئے ۔ جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو طہرانی نے عازم الدین سے کہا۔ شہزادی کے مقبرہ کی سلامتی کی طرف سے ہمیں بالکل بے فکر رہنا چاہیئے اس لیے کہ عربوں کا عقیدہ ہے کہ اس وادی میں غیر انسانی قوتوں کا اثر ہے اور یہاں خبیث روحیں رہتی ہیں ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ وادیٔ اسلاف فرعون کی طرف رخ بھی نہ کریں گے اور ان کی یلغار ہماری ہی سمت ہوگی۔"

"لیکن آقائے طہرانی ۔ ہماری تعداد بالکل کم ہے ۔ اور یہاں سے قریبی بستی بھی کم از کم دس میل کے فاصلہ پر ہے ورنہ ہم فوری طور پر وہاں کے آدمیوں سے مدد حاصل کر سکتے تھے ۔" عازم الدین نے پژمردگی سے کہا۔

" تعداد کی کمی سے ہراساں نہ ہوئیے ڈیڈی ۔ آپ دیکھیے گا کہ میں کتنی شاندار جنگ لڑتا ہوں ۔" سلیم نے بے پروائی سے کہا۔

"لیکن میرے بیٹے ۔ تم نے تو کبھی بندوق بھی نہیں اٹھائی ہے ۔"

عازم الدین کو جواب دینے کے بجائے سلیم صرف مسکرا دیا ۔ بھلا وہ اپنے بوڑھے راسخ العقیدہ باپ کو یہ بات کیسے بتاتا کہ نئی دہلی کے سلیم اور یہاں کے سلیم میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو چکا ہے ۔ طوفانِ حوادث نے ۳½ ہزار سال پرانے دور کو آج کے دور میں ضم کر کے ایک مرتبہ پھر احمس کو زندہ کر دیا ہے ۔ وہ احمس جو اپنے دور کا بہادر ترین نوجوان

تھا اور جس کی ساری عمر جنگ اور صرف جنگ میں گذری تھی۔۔۔

اب ہر شخص اپنے مورچہ پر تھا۔۔۔

دور بہت دور وادی کے شمالی اطراف میں شاہراہ عظیم پر روشنی کی ایک کرن روپہلی تار کی طرح قطار در قطار کھنچی ہوئی تھی۔۔۔ حملہ آور عرب ہر لمحہ نزدیک پہونچے جا رہے تھے۔۔۔ ایک جنگجو اور تجربہ کار سپہ سالار کی طرح سلیم نے خیمہ کے چاروں طرف اور اطراف کے بلند ٹیلوں پر اپنے آدمی تعینات کر دیئے تھے۔۔۔ اور سب کو حکم تھا کہ جیسے ہی وہ اپنی رائفل سے پہلی گولی چلائے۔۔۔ حملہ آور عربوں پر اندھا دھند فائرنگ کر دی جائے۔۔۔

اب حملہ آور بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔۔۔ سلیم نے دیکھا کہ دور پہاڑ کی ایک چوٹی پر ایک گھوڑے سوار نظر آیا۔۔۔ بالکل اچانک اس طرح جیسے کسی مجسمے میں روح پھونک دی گئی ہو۔۔۔ سوار نے چند لمحات تک چاروں طرف دیکھا اور پھر غائب ہو گیا، غالباً وہ نیچے اتر رہا تھا۔۔۔

سلیم بھی اپنی رائفل سمیت اندھیرے میں غائب ہو گیا۔۔۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ کسی بلند چٹان پر پہونچ کر حملہ آوروں کی تعداد کا صحیح اندازہ کر لے۔۔۔ درختوں اور بڑے پتھروں کی آڑ لیتا ہوا وہ پاؤں وہ ایک چٹان پر پہونچ ہی گیا۔۔۔ یہاں سے سڑک بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔۔۔ اب حملہ آور بالکل نزدیک تھے، سلیم نے اندازہ لگایا

— ان کی تعداد تیس سے زائد نہ تھی، سلیم نے اس چٹان پر تنہا آ کر یقیناً بڑا زبردست خطرہ مول لیا تھا۔ وہ کسی لمحہ بھی حملہ آور عربوں کا نشانہ بن سکتا تھا لیکن آبنوس کے درختوں کی گہری چھاؤں اسکی سب سے بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ اندھیرے کی آڑ لیتا ہوا وہ پھر اپنی جگہ واپس آ گیا۔

یہاں طہرانی بیچینی سے اسکی راہ دیکھ رہا تھا۔

"آقائے طہرانی — ان کی تعداد تیس سے زائد نہیں ہے — اور سب گھوڑوں پر سوار ہیں — اور غالباً وہ ہم سب کو غافل سمجھ رہے ہیں کیونکہ ان کے آنے کا انداز انتہائی اطمینان و سکون کا مظاہرہ کر رہا ہے اور ان کی یہی غلط فہمی ان کی موت کا سبب بنے گی۔"

"بہرحال — خدا ہمیں اس جنگ میں کامیاب کرے۔" طہرانی نے کہا۔

"کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم یا تو تمام حملہ آور عربوں کو قتل کر دیں اور یا زندہ گرفتار کر لیں — کیونکہ اگر ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نکل گیا تو ان کا اگلا حملہ انتہائی خوفناک ہوگا اور پھر ہم ان کی کثیر تعداد کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔" سلیم نے سرگوشی کی۔

"اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کا رخ ہماری طرف نہ ہو اور وہ کسی اور طرف جا رہے ہوں۔" طہرانی نے پر امید لہجے میں کہا

"ہاں — اسکا بھی امکان ہے — لیکن بہر صورت ہمیں جنگ

کے لیے بالکل تیار رہنا چاہیئے۔"

دُور بہت دُور سے فائر کی آواز آئی۔ اور سلیم نے دیکھا کہ ایک عرب گھوڑے سوار آگے بھاگ رہا ہے۔ "یقیناً یہ کوئی اور بات ہے۔ یہ حملہ ہم پر نہیں ہے۔ بلکہ شائد اسی گھوڑے سوار کا تعاقب کیا جا رہا ہے" سلیم نے سوچا اور پھر صورت حال کا اندازہ کرنے لگا۔

سلیم کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ حملہ آور عرب اپنے کسی دشمن کا تعاقب کر رہے تھے۔ تقریباً بیس منٹ کے اندر سڑک بالکل صاف ہو گئی۔ اور تعاقب کرنے والے عرب اپنے دشمن پر فائرنگ کرتے ہوئے بہت دُور نکل گئے۔

"میں نتیجہ سے بالکل نا امید ہو گیا تھا۔" طہرانی نے عازم الدین سے کہا۔

"اور میں ہر انجام کیلئے تیار تھا۔" سلیم نے مطمئن انداز میں کہا۔

"خیر۔ باورچی سے کہو کہ سب کے لیے قہوہ تیار کرے۔ اور اس کے بعد سویا جائے۔ ہمارے سفر کا سب سے اہم دن کل ہو گا۔ اس لیے کہ ہمیں کل شہزادی کو بیدار کرنا ہے۔"

حسن کا انتظار کئے بغیر قہوہ پی کر تمام افراد اپنے اپنے خیموں میں واپس سونے کے لیے چلے گئے۔

سلیم بھی رائفل سرہانے رکھ کر سو گیا۔

اسی رات سلیم نے خواب دیکھا کہ وہ بالکل تنہا شہزادی کے مقبرہ میں

کھڑا ہے اور کسی نامعلوم راستے سے داخل ہوا ہے۔۔۔ گلابی پتھر پر شہزادی کا تابوت بالکل اسی طرح رکھا ہوا ہے جس طرح اس نے دن میں دیکھا تھا، اچانک نہایت آہستہ آہستہ تابوت کا ڈھکن اوپر اٹھنے لگا۔۔۔

پھر ایک مرمریں ہاتھ تابوت سے بلند ہوا، مخروطی انگلیوں نے کوئی اشارہ کیا۔۔۔ مقبرہ کی نیم تاریکی میں ایک ہلکی سی روشنی تابوت سے نکل کر باہر پھیلی کہ اچانک فضا میں ایک بھیانک قہقہہ بلند ہوا۔۔۔ "زلیخا۔۔۔ تم اپنے محبوب احمس سے نہیں مل سکتیں۔۔۔ تمہارا منگیتر۔۔۔ ایسا ہرگز نہ ہونے دیگا۔۔۔"

اور تابوت کا ڈھکن دوبارہ بند ہو گیا۔۔۔

سلیم کی آنکھ کھل گئی۔۔۔ اسکا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، خوف سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔۔۔ اپنے پلنگ سے اتر کر وہ خیمہ کے باہر آیا۔۔۔ چاند کی مدھم روشنی میں حسن اصغر ریت پر دبے پاؤں ٹہل رہا تھا۔۔۔

"میں اس لیے نہیں سو رہی ہوں کہ مجھے اسپاتا کی خبیث روح سے ہر وقت خطرہ ہے۔۔۔ اور وہ تم پر کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔۔۔"

حسن اصغر نے پرسکون انداز میں کہا۔۔۔ اور پھر ٹہلنے لگا۔۔۔ "میں جانتا ہوں تم یقیناً اپنا کوئی بھیانک خواب سنانے کے لیے میرے پاس آ رہے ہو گے لیکن سلیم۔۔۔ خوابوں کے پیچھے دوڑ کر پریشان نہ ہو۔۔۔"

"نہیں حسن اصغر۔۔۔ میں قطعی پریشان نہیں ہوں اور اب تو مجھے بھی سب کچھ یاد آ گیا ہے۔۔۔"

"کیا یاد آگیا ہے ـــ"

"یہی کہ میرا نام احمس ہے ـــ"

"لیکن احمس ـــ تمہیں صرف سیٹھ اول کے دور کے وہ واقعات یاد آئے ہونگے جو تمہاری موت تک ہوئے تھے ـــ"

"ہاں ـــ"

"لیکن مجھے تمہارے بعد ـــ اور اپنے بعد تک کے تمام واقعات یاد ہیں ـــ خدا کی قسم اگر میں اس ۳½ ہزار سال پرانی تاریخ کو لکھنے بیٹھوں تو دنیا انگشت بدنداں رہ جائے گی ـــ"

"مثلاً ـــ" سلیم نے اضطرابی انداز میں کہا۔

"مثلاً میں یہ بتاؤں کہ اسی مصر نے دنیا کی سب سے پہلی مطلق العنان ملکہ "حطشی پط" پیدا کی تھی جس نے پورے بائیس سال تک دنیا کے سب سے زیادہ خوشحال، مہذب اور طاقتور ملک کو اپنی مٹھی میں رکھا تھا۔ اسی مصر نے دنیا کا پہلا بین الاقوامی فاتح توتمس پیدا کیا تھا جس نے موجودہ مشرقِ وسطیٰ پر پورے انیس حملے کیے اور مصر کو ایک نئی تہذیب، ایک نئی دولت اور زندگی کی ایک نئی کروٹ سے روشناس کرایا ـــ اور اسی مصر نے تاریخ انسانی کے پہلے موحد فلسفی، مفکر، شاعر، اور بادشاہ اخناتون کو پیدا کیا جس نے دنیا کو توحید کا اولین درس دیا اور بت پرستی کی اعلانیہ مخالفت کی ـــ۔

سلیم ـــ مصر کا ہر گوشہ، اور ہر گوشہ میں پھیلا ہوا ہر پتھر ایک مکمل

تاریخ ہے اور میں اس تاریخ کا آنکھوں دیکھا مورخ ہوں، ــــ ایک ایسی تاریخ کا مورخ جو کتابوں میں نہیں ملتی، پرانے کتبوں میں نہیں ملتی ــــ اہرام کے نقش و نگار میں نہیں ملتی ــــ

مثال کے طور پر تھیبس کے سامنے نیل کے کنارے مغربی کنارے پر "دیر البحری" نام کا ایک قدیم مندر موجود ہے جس کے بارے میں مورخ صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ مصر کی پہلی ملکہ "حطشپسط" نے اپنی یادگار بطور بنوایا تھا ــــ آج کے سیاح اس کے طرز تعمیر اور دل نشین نقاشی اور مصوّری دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں ــــ لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ ملکہ نے یہ عظیم الشان مندر کیوں تعمیر کر دیا جبکہ مصر میں اُس وقت بھی آمن دیوتا کے اور بھی لاتعداد مندر موجود تھے ــــ

خدا کی قسم سلیم ــــ میں اس وادی کی پوری تاریخ جانتا ہوں، اس وادی میں موت کی ابدی نیند سونے والے ہر مصری فرمانروا کی داستان جانتا ہوں ــــ اور صرف اس لیے جانتا ہوں کہ مجھے زلیخا کی مسلسل نیند ناپسند تھی، میں اس کو بیدار کرنا چاہتا تھا ــــ میں اس کو اس کے بچھڑے محبوب سے ملانا چاہتا تھا اور میں اپنی وہ قسم پوری کرنا چاہتا تھا جو میں نے اس کے تابوت کا ڈھکنا بند ہوتے وقت کھائی تھی ــــ

سلیم ــــ ہر زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو زندگی تھک جاتی ہے، تھک کر سو جاتی ہے، ــــ اور دنیا کہتی ہے فلاں انسان مر گیا ــــ

میری زندگی کا بھی ایک مقصد ہے ۔ یہی وہ مقصد تھا جس نے صدیوں تک مجھے مختلف ناموں سے زندہ رکھا اور مجھے اپنا مقصد اور اپنا مقصد یاد رہا ۔ سوچتا ہوں کل جب زلیخا کی بیداری کے بعد یہ مقصد پورا ہو جائیگا ۔ تو میری زندگی بھی بے مقصد ہو جائیگی اور ظاہر ہے کہ بے مقصد زندگی کی منزل موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی ۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھ پایا گیتاری ۔" سلیم کو الجھن سی ہونے لگی ۔

"مطلب بالکل صاف اور واضح ہے سلیم ۔ تم جس گیتاری کو حسن صغیر کے روپ میں دیکھ رہے ہو وہ ہزاروں سال پہلے مر چکا تھا لیکن ایک مقصد کی خاطر موت اس پر قابو پاتی رہی اور رہا کرتی رہی ۔ اور وہ مختلف نام بدلتا رہا ، اس کی روح ایک رہی ، جسم ایک رہا ، خدوخال ایک رہے ، ذہن ایک رہا ، صرف نام بدلتے رہے ۔ اور وقت تیزی سے بھاگتا رہا ۔ اب تم خود بتاؤ کہ جب یہ مقصد حاصل ہو جائیگا تو گیتاری کی زندگی کی ۔ جو مرنے کے باوجود زندہ تھا کیا ضرورت باقی رہ جائے گی ۔ اور پھر زندہ رہتے رہتے ۔ دنیا دیکھتے دیکھتے ، قوموں کا عروج و زوال دیکھتے دیکھتے ، تہذیب و تمدن کا اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے تمھارا گیتاری بھی تھک گیا ہے ۔ اور وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح ایک گہری اور نہ بیدار ہونے والی ابدی نیند سو جانا چاہتا ہے ۔"

یعنی ۔ تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زلیخا کے بیداری کے بعد

— تم ہم دونوں کو — سلیم یہاں تک کہنے پایا تھا کہ حسن اصغر نے بات کاٹ دی —

"ہاں — میں تم دونوں کو ہی نہیں — اس فانی دنیا کی ہر شئے کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا — سلیم — اگر کل شہزادی بیدار ہوتی ہے تو تم یوں سمجھ لو کہ آج کی رات تمھارے دوست گیتاری کی زندگی کی آخری رات ہے — مجھے پورا یقین ہے کہ میں کل شام کا ڈوبتا ہوا سورج اپنی مادّی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں گا"

"نہیں حسن اصغر — ایسا نہیں ہو سکتا" سلیم تقریباً چیخ پڑا،

"ایسا ہو کر رہیگا سلیم — زلیخا بیدار ہوگی تو گیتاری اپنا آخری رختِ سفر ضرور باندھے گا — اس لیے تم — یعنی احمس میری وصیت بھی سُن لو — قدیم دستاویز میں زلیخا کی بیداری کے لیے جن دواؤں کا تذکرہ ہے وہ میں نے ترتیب سے اس کے تابوت کے پاس والی تپائی پر رکھدی ہیں — یہ دوائیں پہلے سے ہی کمرے کی ایک سنگی الماری میں موجود تھیں — کوئی دوا اور کوئی مرکّب کم نہیں ہے — جیسے ہی زلیخا بیدار ہو کر اپنی زندگی کی پہلی انگڑائی لے گی — اور جیسے ہی وہ اپنی لانبی پلکوں کو اٹھا کر ہم دونوں کو دیکھے گی — اور جیسے ہی اس کے شبنم سے زیادہ پاکیزہ اور پھولوں سے زیادہ نازک لبوں پر کنواری مسکراہٹ پھیلے گی — میرا مقصدِ حیات پورا ہو جائیگا —

اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں گی — اور میں محض چند لمحات

کے اندر اپنے اسلاف کے مسکن کی طرف واپس لوٹ جاؤں گا۔ میرا بے جان جسم وہیں اکڑ کر گر جائے گا۔

میری کوئی قبر نہ بنانا سلیم۔ زلیخا کا تابوت خالی ہوگا۔ بس تم اسی تابوت میں مجھے لٹا دینا، اسکا ڈھکن بند کر دینا اور پھر جب زلیخا کو لیکر مقبرہ سے باہر نکلنا تو مقبرہ کا داخلی دروازہ بھی بند کر دینا۔

سلیم ــــ تمھیں کل کے بعد ایک نئی زندگی شروع کرنا ہے ایک ایسی زندگی جس کا ارمان زلیخا کی ہر سانس میں موجود تھا۔ اس لیے میری موت پر ایک بھی آنسو نہ بہانا۔ غم کا کوئی اظہار نہ کرنا ــــ چہرہ پر ملال کی ایک بھی لکیر نہ پیدا ہونے دینا ــــ اور مڑ کر بھی میرے تابوت کی طرف نہ دیکھنا ــــ

اسپاتا کا خبیث وجود میرے ذہن میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے لیکن ابھی کافی وقت ہے، زلیخا کی بیداری سے قبل ہی میں اس کا بھی بندوبست کر دونگا اور وہ بھی تم دونوں کے مقابلہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو کر رہ جائے گا ــــ سلیم زندگی ایک بڑی پیاری چیز کا نام ہے اس لیے آخری سانس تک اسکا لطف اٹھانا ــــ یہی زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔"

حسن اصغر ابھی اور کچھ کہتا لیکن سلیم نے اسکی بات کاٹ دی "اسکا مطلب یہ ہے کہ زلیخا کی بیداری کے لیے مجھے اپنے دوست کو قربان کرنا پڑے گا ــــ میں ایک زندگی دیکر دوسری زندگی لونگا نہیں حسن اصغر ــــ

نہیں گیتا ری ایسا نہیں ہو سکتا ۔۔۔ تم نے اپنی وصیت بیان کر دی ۔۔۔
اب میرا بھی آخری اور اٹل فیصلہ سُن لو ۔۔۔

اگر زلیخا کی بیداری کا مطلب حسن اصغر کے نیک وجود کی موت ہے تو زلیخا کبھی بیدار نہ ہوگی ۔۔۔ وہ سو رہی ہے اور سوتی رہے گی ۔۔۔"

"بچوں کی سی باتیں نہ کرو سلیم ۔۔۔ کہانی کو ختم ہونا ہے اس میں مزید الجھنیں نہ پیدا کرو ۔۔۔ اب اس داستان کا باب بند ہی ہو جانا چاہیئے ۔۔۔ زلیخا سوتے سوتے تھک گئی ہے اور میں جاگتے جاگتے تھک گیا ہوں ۔۔۔ اور اب جبکہ میں سب کچھ تم کو بتا چکا ہوں مجھے پوری امید ہے کہ تم میری وصیت پر لفظ بہ لفظ عمل کرو گے ۔۔۔ اچھا اب جاؤ ۔۔۔ سو رہو ۔۔۔ کل دن میں ہم سب کو بے انتہا کام کرنا ہے ۔۔۔"

"میں جا رہا ہوں ۔۔۔ لیکن حسن اصغر اتنی بات یاد رکھنا کہ اب زلیخا سوتی ہی رہے گی ۔۔۔" سلیم دل شکستہ ہو کر معاملہ کے اس نئے پہلو پر غمزدہ ہو کر وہاں سے چلا آیا اور حسن اصغر چاندنی میں نہائے ہوئے ایک بت کی طرح وہیں کھڑا رہا ۔۔۔

وادی میں بالکل سناٹا طاری تھا ۔۔۔ ہوا سرد ہو کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی ۔۔۔ کھجور کی شاخیں دم بخود کھڑی تھیں اور دُور نیل کا پانی اچھل اچھل کر بہہ رہا تھا ۔۔۔

حسن اصغر نے ایک ٹھنڈی سانس لی ۔۔۔ گردن گھما کر چاروں طرف

دیکھا۔ ماحول کی اداسی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ پھر سلیم کے خیمہ اور زلیخا کے اونچے مقبرہ کی طرف دیکھا۔ گویا نظروں ہی نظروں میں وہ سب کو الوداعی سلام کر رہا ہو۔

—o═══✻═══o—

باب ـــــــ ۱۵

"رات عربوں کے غیر متوقع حملے نے تو میرے حوصلے پست کر دیئے تھے" ناشتہ کی میز پر ڈاکٹر بیگ نے کہا اور پروفیسر نے گردن ہلا کر اپنی طرف سے بھی اس خیال کی تصدیق کر دی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" عازم الدین نے کہا۔ "بخدا میں تو ابتک کمزوری محسوس کر رہا ہوں ـــ حالانکہ بظاہر اب کوئی خطرہ نہیں رہا" یہ کہہ کر اس نے فرشت جانے والی سڑک پر جو دُور سے ایک موٹی لکیر معلوم ہو رہی تھی غور سے دیکھا۔

"حسن اصغر کی بروقت خبر نے ہم سب کو ہوشیار کر دیا ـــ ورنہ اگر واقعی حملہ ہوتا تو ہم سوتے کے سوتے ہی رہ جاتے" پروفیسر نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"واقعی وہ بہت ہوشیار اور نیک آدمی ہے۔" طہرانی نے کہا۔

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ ہمیں مل گیا یا کسی اسرار کے تحت خود اس نے ہمیں تلاش کر لیا ـــــ دوستوں ـــــ میرا تو خیال ہے کہ ایسا شخص اب مصر میں کبھی پیدا نہ ہوگا ـــــ کیونکہ اس میں یقیناً بعض ایسی صفات ہیں جو صرف فوق البشر میں ہی ہوتی ہیں۔"

"خیر ـــــ اب آج کا کیا پروگرام ہے۔" عازم الدین بولا۔

"تابوت کا وزنی ڈھکن کھولنا ـــــ اور شہزادی کا بیدار کرنا۔" طہرانی نے جواب دیا۔

"بالفرض محال اگر یہ مان لیا جائے کہ تابوت خالی ہوگا ـــــ تو ـــــ" ڈاکٹر بیگ ہمیشہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کا عادی تھا۔

"نہیں ـــــ وہ خالی نہیں ہوگا ـــــ دستاویز کے بموجب اس کا ڈھکن راعمیس کے دورِ حکومت کے بعد آج تک نہیں کھولا گیا ـــــ" طہرانی نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تابوت نہ کھولا گیا ہو تب بھی اس مقبرہ میں ہمارے علاوہ کچھ اور بھی لوگ کبھی نہ کبھی ضرور داخل ہوئے ہونگے ـــــ اور میری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ مقبرہ میں زلیخا سے متعلق کوئی سامان موجود نہیں ہے جبکہ قدیم مصر میں یہ رواج تھا کہ وہ مقبرہ میں مردے کی ہر چیز رکھدیا کرتے تھے اور تمام مکروں کو آراستہ کے انداز میں سجا دیتے تھے۔" ڈاکٹر بیگ نے رائے دی۔

"آپ کی بات قرین قیاس ضرور ہے، ہو سکتا ہے عرب بدوؤں کا کوئی گروہ اسکی کوئی دیوار توڑ کر اسمیں داخل ہوا ہو اور تمام سامان اٹھا لے گیا ہو۔ لیکن تابوت کھولا گیا ہے یہ بات میں نہیں مانتا۔" طہرانی نے جواب دیا۔

"لیکن ۔ کیوں ۔؟" عازم الدین نے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ تابوت کا ڈھکن کافی وزنی ہے وہ توڑا جا سکتا ہے اٹھایا نہیں جا سکتا ۔ اور چونکہ وہ ہمیں بالکل صحیح وسالم ملا ہے اسلیئے تابوت ان چوروں سے محفوظ رہا۔" طہرانی نے زور دے کر کہا۔

"جب آپ کا یہ استدلال ہے تو آخر ہم اس وزنی ڈھکن کو کس طرح اٹھائیں گے۔" ڈاکٹر بیگ نے سوال کیا۔

"اس کے لیے ہمارے پاس ایک جیک[1] موجود ہے، بمبئی میں جہاں میں نے اور سامان خریدا تھا وہاں یہ آلہ بھی خرید لیا تھا۔" طہرانی نے مسکرا کر کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ناشتہ کے فوراً بعد تمام ضروری سامان مقبرہ کے اندر پہونچا دیا جائے ۔ اور ہاں ۔ ابھی تو آپ کو وہ اشیاء بھی مقبرہ میں تلاش کرنی ہیں جن کے بغیر زلیخا کی بیداری محال ہے اور جن کا تذکرہ قدیم دستاویز میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔"

"وہ میں تلاش کر چکا ہوں۔" خیمہ میں داخل ہوتے ہوئے حسن اصغر نے بالکل ڈرامائی انداز میں کہا۔ "آپ لوگوں کے علم کے بغیر میں تمام

---

[1] جیک ۔ ایک آلہ ہوتا ہے جس کی مدد سے وزنی چیز آسانی سے اٹھائی جاتی ہے۔

رات زلیخا کے مقبرہ میں موجود رہا اور میں نے تابوت کے قریب والی تپائی پر تمام دوائیں، تیل اور مرکبات ترتیب سے رکھ دیئے ہیں۔"

"کم از کم مجھے یعنی آقائے طہرانی کو تمھاری ذات سے یہی امید تھی۔"

"شکریہ۔" حسن اصغر نے مسکرا کر کہا۔ "اور اب ہمیں وہاں جانے میں تاخیر نہ کرنا چاہیئے۔ زلیخا کی بیداری کا کام جس قدر جلد ختم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

اور سلیم کی آنکھیں اس تصوّر سے ہی کانپ گئیں کہ جو حسن اصغر زندگی کی بھرپور ساعتوں کے ساتھ اس وقت ہم سب کی نگاہوں کے سامنے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا ہے وہ زلیخا کے بیدار ہوتے ہی مر جائیگا۔

حسن اصغر نے سلیم کے چہرے کے یہ تاثرات بھانپ لیے اور فوراً خیمہ کے باہر چلا گیا۔ سلیم نے چاہا کہ وہ اس وقت جبکہ پارٹی کے تمام افراد ایک ہی جگہ موجود ہیں اب تک کی پوری داستان بیان کر دے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکا۔ زلیخا کی محبت، اسکا حسن، اس کی نیلی آنکھیں، اسکا مرمریں جسم، اس کی مخروطی انگلیاں، ـــــ اس کا شباب سے بھرپور جسم، اور اس کے انتظار کے طویل لمحات اسکے جذبات پر حاوی ہو گئے۔ ـــــ اور وہ خاموش رہ گیا۔ ـــــ

دس بجے بجے حسن اصغر کی قیادت میں پوری پارٹی تمام ساز و سامان کے ساتھ شہزادی کے مقبرہ میں داخل ہو گئی۔ ـــــ

پہلی سُرنگ کے خاتمہ پر سلیم نے حسن اصغر کے چہرے پر نظر ڈالی ۔۔۔ اور کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے خفیف سے فاتحانہ تبسم کو دیکھ کر خاموش ہو گیا ۔۔۔ غالباً دونوں اپنے اپنے فیصلوں پر قائم تھے ۔۔۔ لیکن ایک کا فیصلہ آہنی تھا اور دوسرے کا نیم آہنی ۔۔۔ ایک کا تعلق انسان کی وفا سے تھا اور دوسرے کا جوانی کے اندھے جذبات سے ۔۔۔

تابوت کے قریب پہونچ کر طہرانی نے چار مشعلیں جلا کر کمرے کے چاروں گوشوں میں نصب کر دیں اور اس طرح پورا کمرہ روشن و منور ہو گیا ۔۔۔ تیز روشنی میں سلیم نے دیکھا کہ تابوت کے پتھر پر کوئی عبارت کندہ نہ تھی لیکن مقبرہ کی دیواروں پر نہایت خوبصورتی سے رنگ و روغن کیا ہوا تھا ۔۔۔

کمرے میں بیحد گرمی تھی ۔۔۔ فضاء میں گھٹن سی تھی اور ہر شخص خاموش تھا لیکن طہرانی سے یہ خاموشی برداشت نہ ہوئی اس نے اپنی بھاری آواز میں کہا "شہزادی زلیخا کا نام جا بجا کندہ نظر آتا ہے ۔۔۔ کمرے کی زیب و زینت کا بھی معماروں نے کافی خیال رکھا ہے ۔۔۔ یقیناً یہاں سنگ تراشی کے ذریعہ اپنے دور کی بہترین تصاویر نقش کی گئی ہیں ۔۔۔ یہ نیل کے گہرے پانی پر کشتیوں کے جلوس ۔۔۔ کاہن کی عارفانہ بیخودی ۔۔۔ تجہیز و تکفین کی رسومات کی تکمیل کا منظر اور اسی قسم کے دوسرے مناظر اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی آفرین طلب ہیں ۔۔۔

قدیم مصریوں کے نزدیک کنول کا پھول اور آئینہ ۔۔۔ حیات جاوید کی نشانیاں تھیں اور یہ دونوں چیزیں بھی کمرے کی دیواروں پر جگہ جگہ

بنا ہیں۔ طہرانی نے اپنی بات ختم کر کے سلیم کی طرف دیکھا جو گردن جھکائے ایک عالم بیخودی میں تابوت کو دیکھ رہا تھا، اس کے چکنے پتھر کو چھو رہا تھا اور بار بار ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا۔

نزدیک کی تپائی پر طشتریاں، پیالے، شیشیاں اور سونے کے بنے ہوئے سات چراغ رکھے ہوئے تھے۔ اور یہی وہ چیزیں تھیں جو زلیخا کی بیداری میں استعمال ہونے والی تھیں، ڈاکٹر بیگ کبھی تابوت کی طرف دیکھتا اور کبھی تپائی پر رکھے ہوئے سامان کی طرف۔ اسی اثنا میں اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک شیشی کو جس میں کوئی سیال مادہ بھرا ہوا تھا اٹھانا چاہا۔ کہ طہرانی چیخ پڑا۔ "نہیں ڈاکٹر۔ ابھی کوئی شے مت چھوئیے۔"

اور کبیدہ خاطر ہو کر ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"تپائی پر رکھی ہوئی چیزیں وہی ہیں جن کا قدیم دستاویز کے ضابطہ میں درج ہے، یہی وہ عناصر ہیں جو آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل دیوتا داؤ کے آخری کاہن نے زلیخا کو جگانے کے لیے متاخرین کے لیے ترتیب دیے تھے۔"

"ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے اس پر حیرت ہے کہ اتنا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود ان دواؤں میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، نہیں طہرانی۔ یقیناً یہ کوئی سحر ہے اسکا تعلق علم طب سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر بیگ کے چہرے پر واقعی حیرانی ٹپک رہی تھی۔"

"یہ کوئی نیا خیال نہیں ـــ ناقابل یقین باتوں اور مظاہروں کو انسان نے ہمیشہ سے سحر کہا ہے ـــ" طہرانی نے ذرا سخت لہجے میں کہا ـــ "بہرحال جو کچھ ہے وہ ہمارے سامنے ہے ـــ اور اب ہمیں ڈھکن کھولنے کی تیاری کرنا چاہیئے ـــ"

عازم الدین گرمی کی شدت کی وجہ سے ابھی سے حد درجہ تکان محسوس کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ بیداری کا کام جلد از جلد ختم ہو جائے ـــ چنانچہ اس نے طہرانی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "تابوت کا ڈھکن اٹھانے میں اندازاً کتنا وقت صرف ہو گا ـــ"

جو آلات ہمارے پاس ہیں ان کی مدد سے زیادہ وقت صرف ہونیکا امکان نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک گھنٹہ ضرور لگے گا کیونکہ کام شروع کرنے سے پہلے حد درجہ احتیاط اور بہت سی دیگر تدابیر ضروری ہیں ـــ"

حسن اصغر نے گفتگو میں کوئی دلچسپی نہ لی ـــ وہ غور سے پروفیسر ارشد کے اکتائے ہوئے چہرہ کو دیکھ رہا تھا ـــ آخر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے دھیمی آواز میں پروفیسر کو مخاطب کر کے کہا ـــ "غالباً اس وقت بھی آپ یہی سوچ رہے ہیں کہ شہزادی زلیخا کی روایت بے بنیاد ہے، اس نام کی شہزادی کا کوئی وجود نہ تھا بلکہ یہ ان مذہبی پیشواؤں کا گھڑا ہوا کوئی افسانہ ہے جو کمزور اعتقاد مصریوں کو بیوقوف بنانے کے لیے تصنیف کیا گیا تھا ـــ لیکن پروفیسر صاحب دو گھنٹے کے اندر جب زلیخا اپنی بھیل ایسی شفاف اور پرسکون آنکھیں کھول کر آپ سب کو دیکھے گی تو آپ کی غلط فہمی دور ہو جائیگی

اور غالباً اس کے بعد آپ خود اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ علم کیمیا اور طب قدیم کے بارے میں آپ نے اب تک جو کچھ پڑھا تھا اس کی حیثیت ابتدائی درس سے زیادہ نہیں ہے۔"

لیکن پروفیسر نے حسن اصغر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

طہرانی اور دیگر مزدور تابوت کے قریب جیک نصب کرنے لگے۔ کام میں انہماک پیدا ہو گیا۔ خاموشی کے باوجود سلیم کے علاوہ ہر شخص کے چہرے پر جوش اور خوشی کے ملے جلے جذبات موجود تھے۔ ڈاکٹر بیگ اب بھی سوچ رہا تھا کہ تپائی پر رکھی ہوئی دوائیں اور دیگر مرکبات ہزاروں سال گذرنے کے بعد بھی دور حاضرہ تک کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔"

سب کو اپنے اپنے کاموں میں مصروف دیکھ کر سلیم نے انتہائی آہستہ آواز میں حسن اصغر سے کہا۔ "گیتاری۔ کیا واقعی رات کو تم نے جو کچھ کہا ہے تم اس پر عمل کرو گے؟"

"ہاں احمس۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ پھر پتھیں شاید نہیں معلوم کہ بیداری کے بعد اپنی موت روکنا میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ میں مجبور ہوں احمس۔ قدرت اور قانون قدرت سے لڑنے کی طاقت نہ مجھ میں ہے اور نہ تم میں۔"

"لیکن اگر شہزادی بیدار نہ ہوئی تو۔"

"یہ بالکل ناممکن ہے۔ گیتاری کی زندگی میں یہ بالکل ناممکن ہے۔ زلیخا ضرور زندہ ہو گی اور گیتاری اس دنیا سے ضرور جائے گا۔

احمس ـــ مجھے اس بارے میں اتنا یقین ہے جس طرح شام کو سورج ڈوبنے کا یقین ہے ـــ اور اسکا ثبوت یہ دیکھو ـــ" اور یہ کہہ کر حسن اصغر نے اپنی مصری عبا کا دامن اُٹھا کر سلیم کو اپنا اندرونی لباس دکھا دیا ـــ.

عبا کے نیچے حسن اصغر کفن پہنے ہوئے تھا ـــ.

"میں نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنا کفن پہن لیا ہے تاکہ تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو میری وصیت پر عمل کرنے میں کوئی دقت نہ ہو ـــ"

اور سلیم ایک زندہ انسان کے جسم پر مُردوں کا کفن دیکھ کر کانپ گیا ـــ اس کو افسوس تھا کہ کوئی چیز اس کے اختیار میں نہیں ہے ـــ ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا بھی کہ ہاتھ مار کر وہ تپائی پر رکھی ہوئی تمام ادویات پھینک دے اور اس طرح زلیخا کی بیداری ناممکن ہو جائے لیکن جیسے وہ سحر زدہ ہو چکا تھا ـــ ارادے کے باوجود اس کے ہاتھوں کو حرکت نہ ہوئی ـــ.

حسب وعدہ ایک گھنٹہ کے اندر طرانی نے جیک کو نصب کر لیا اور ڈھکن اٹھانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لیں ـــ تمام افراد بےچینی کے ساتھ تابوت کے نزدیک آ گئے ـــ لیکن قبل اس کے کہ جیک حرکت میں آتا حسن اصغر نے کہا ـــ "اس تابوت کے اندر انجیر کی لکڑی کا بنا ہوا ایک اور تابوت ہوگا جس پر نہایت نفاست اور خوبصورتی سے رنگ و روغن کیا ہوا ہوگا ـــ ہمیں اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ ہمیں اس

اندر والے تابوت کا ڈھکن بھی کھولنا ہے ۔۔۔"

"حسن اصغر ۔۔۔ تم مجھے نادان نہ سمجھو ۔۔۔ قدیم دستاویز میں سب کچھ لکھا ہوا ہے اور یہ دستاویز میں متعدد بار پڑھ چکا ہوں ۔۔۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دستاویز میں لکھے ہوئے ضابطہ کی ہدایات کے بموجب اندرونی تابوت کھولنے کے بعد عمل بیداری شروع کرنے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہ ہونا چاہیئے ۔۔۔"

"واللہ ۔۔۔ وہ منظر بھی کتنا عجیب ہوگا کہ شہزادی زلیخا نے اگر وہ ابھی تک واقعی زندہ ہے آخری بیداری سے قبل دو عمیس نہم اور دیوتا رادے کے کاہنوں کو قدیم ترین مصری لباس میں اپنے مقبرہ کے چاروں طرف دیکھا ہوگا لیکن آج جب وہ بیداری کے بعد اپنی آنکھ کھولے گی تو اسے فرعون کے بجائے طہرانی اور کاہنوں کے بجائے ہم سب اپنے مغربی اور نیم عربی لباس میں ملبوس نظر آئیں گے ۔۔۔ طہرانی ۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہیں وہ ہم سب کو دیکھ کر ڈر نہ جائے ۔۔۔ وہ ہمیں بھوت نہ سمجھ بیٹھے ۔۔۔ یا ہمیں عالم بالا کے انسان سمجھ کر پاگل نہ ہو جائے ۔۔۔" ڈاکٹر بیگ نے ازراہ تمسخر کہا ۔۔۔ لیکن طہرانی کے دل میں یہ بات تیر کی طرح بیٹھ گئی ۔۔۔

"تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر ۔۔۔ ہم میں سے چند آدمیوں کو واقعی قدیم مصریوں جیسا لباس پہن لینا چاہیئے ۔۔۔" طہرانی نے کچھ سوچ کر کہا ۔۔۔

"نہیں اسکی ضرورت نہیں ۔۔۔ ہم صرف یہ بندوبست کریں کہ جب شہزادی آنکھ کھولے تو سب سے پہلے اسکی نگاہ سلیم پر پڑے اور پھر

مجھ پر ۔۔۔ حسن اثر نے مداخلت کی ۔۔۔

"صرف سلیم اور رحم پر کیوں ۔۔۔؟" عازم الدین بیٹے کی محبت میں گھبرا گیا،

"مجھ پر اعتبار کیجئے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کیجئے۔ رہا آپ کا یہ پدرانہ اور مشفقانہ سوال ۔۔۔ تو اس کا جواب آپ کو آئندہ ساعتوں میں مل جائے گا۔"

"خیر ۔۔۔ فی الحال اس سنگی تابوت کا ڈھکنا تو اٹھنے دو ۔۔۔" طہرانی نے یہ کہکر جیک کی مشین کا بٹن دبا دیا ۔۔۔ مشین کا آہنی پنجہ حرکت میں آیا ۔۔۔ پتھر کھسکنے کی ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی ۔۔۔ ایک انچ ۔۔۔ دو انچ ۔۔۔ تین انچ ۔۔۔ پتھر مسلسل اٹھ رہا تھا ۔۔۔ ہر شخص دم بخود تھا ۔۔۔ سب کی نگاہیں اٹھتے ہوئے پتھر پر جم کے رہ گئی تھیں ۔۔۔

دس منٹ کے اندر انتہائی احتیاط کے ساتھ مشین نے ڈھکن کو تابوت سے تین فٹ اوپر بلند کر دیا ۔۔۔ اور پھر سب نے تابوت کے اندر جو کچھ دیکھا اس نے دستاویز کی اصلیت اور صداقت کی مکمل تصدیق کر دی ۔۔۔

پتھر کے تابوت کے اندر انجیر کی لکڑی کا بنا ہوا ایک اور خوشنما کنول نما تابوت موجود تھا ۔۔۔ جس کے ڈھکن پر شہزادی زلیخا کی ایک رنگین تصویر بنی ہوئی تھی ۔۔۔ بالکل اسی تصویر کی طرح جو خان بہادر عازم الدین کی لائبریری میں موجود تھی ۔۔۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس تصویر میں زلیخا

کی نیلی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ کھڑی ہوئی تھی لیکن اس تصویر میں اسکی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے لیٹی ہوئی تھی۔۔۔

لکڑی کا یہ تابوت اور اس پر بنی ہوئی تصویر دیکھ کر مقبرہ میں موجود ہر فرد کا دل لرز گیا۔۔۔

ویسی ہی پلکیں۔۔۔ ویسے ہی سنہرے بال، ویسا ہی سفید لباس، وہی ماہ پیکر۔۔۔ مصری حسن کا وہی شاہکار۔۔۔ سلیم کے خوابوں کا سکون۔۔۔ حسن اصغر کی زندگی کی منتہائے مقصود۔۔۔ شہزادی زلیخا کی عجوبۂ روزگار تصویر۔۔۔

یہ تصویر قدیم مصری فن کا معجزہ تھی یا فریب نظر۔۔۔ لیکن اے کاش اس تصویر کو دیکھنے کے بجائے کوئی شخص حسن اصغر کے چہرے کی طرف دیکھ لیتا جس پر بتدریج ایک لافانی سکون پھیلتا جا رہا تھا۔۔۔

"فرط جذبات سے سلیم کے مضبوط جسم میں رعشہ سا آ گیا۔" بس اسی تابوت میں دنیا کی حسین ترین عورت اپنے محبوب کے انتظار میں ہزاروں سال سے سو رہی ہے۔۔۔"

کسی کو کچھ ہوش نہ تھا۔۔۔ ورنہ وہ یہ ضرور دیکھ لیتے کہ ڈر سے اور سہمے ہوئے مصری مزدور انتہائی خاموشی کے ساتھ دبے قدموں مقبرہ سے باہر جا چکے ہیں۔۔۔

"حیرتناک اور ناقابل تصور۔۔۔" ڈاکٹر بیگ کی زبان سے بیساختہ نکلا

"لیکن ایک زندہ اور ٹھوس حقیقت ـــ" عازم الدین نے گویا تصدیق کی ـــ

"مجھ میں اب مزید تاب ضبط نہیں ـــ میں اس صندوق کا ڈھکن بھی کھولنا چاہتا ہوں ـــ" طہرانی کی آواز میں بھی ارتعاش موجود تھا ـــ

"نہیں ـــ بالکل نہیں ـــ" مقبرہ میں ایک تیز آواز گونجی۔ "میں اپنے گیتا دی کو نہیں جانے دوں گا ـــ میری نظروں کے سامنے ایسا نہیں ہو سکتا ـــ ایسا نہیں ہو سکتا ـــ" اور پاگلوں کی طرح چیختا ہوا سلیم یہ کہتے ہی زلیخا کے سنگی تابوت پر گر پڑا ـــ

وہ پوری طرح بے ہوش تھا۔

باب ـــــــ ۱۶

اس خلاف توقع حادثے نے پارٹی کا پروگرام درہم برہم کر دیا، حیرانی اس پر تھی سلیم بیہوش کیوں ہو گیا ـــ وہ کس کو جانے سے روکنا چاہتا ہے ـــ یہ گیتا رمی کون ہے ـــ یہ سب سے پریشانی عازم الدین کو تھی ـــ اسکا اکلوتا بیٹا اس طرح بیہوش ہو جائے گا یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا ـــ

"آپ پریشان نہ ہوں ـــ سلیم کو ابھی چند منٹ میں ہوش آ جائے گا" حسن اصغر نے سلیم کو فرش پر لٹاتے ہوئے کہا ـــ

"ہوش آئے یا نہ آئے ـــ آج کا کام ختم کیا جاتا ہے ـــ لکڑی کا تابوت کل دن میں کھولا جائیگا اور بیدار ی کا کام بھی کل ہی کیا جائیگا" طہرانی نے فیصلہ کن انداز میں کہا ـــ

"لیکن میرا خیال ہے کہ کام آج ہی ختم ہو جائے۔" حسن اصغر نے بجھے ہوئے انداز میں مداخلت کی۔

"نہیں — میں کسی ذہنی الجھن یا اضطرابی کیفیت کے ساتھ اتنا اہم کام نہیں کر سکتا حسن اصغر — اس کے بعد تم خود سمجھ دار ہو —" طہرانی نے فیصلہ کیا۔

پتھر کا ڈھکن مشین کی مدد سے دوبارہ بند کیا گیا اور بیہوش سلیم کو لیکر تمام افراد خیمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

عازم الدین کی آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے — بیہوشی اور اچانک بیہوشی ہر فرد کے لیے ایک راز سی بن گئی تھی — صرف حسن اصغر جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا اور سلیم کی اچانک بیہوشی کا راز کیا ہے —

"بیچارہ احمس — اسے کیا معلوم تھا کہ تقدیر کی لکیروں کو کوئی نہیں مٹا سکتا — گیتاری کی روانگی مقدر بن چکی ہے — آج نہیں تو کل — اسے تو جانا ہی پڑے گا —"

خیمہ والوں کے لیے یہ شام بڑی اداس اور بے کیف تھی سلیم کو ہوش آ چکا تھا لیکن وہ بالکل خاموش رہا — اس نے کسی کے سوال کا جواب نہیں دیا — اور پلنگ پر ہی لیٹا رہا — ادھر حسن اصغر کے ایما پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ مزدور بھاگ چکے ہیں اس لیے تمام رات مقبرہ کے چاروں طرف پہرا دیا جائے۔

بات معقول تھی اس لیے مان لی گئی — اور طہرانی، عازم الدین

ڈاکٹر بیگ، حسن اصغر اور پروفیسر ارشد نے مسلح ہو کر پہرہ دینا شروع کر دیا۔ مقبرہ کے چاروں کونوں پر ایک ایک آدمی کی ڈیوٹی تھی اور حسن اصغر کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ چاروں طرف گھومتا رہے۔

ہوش میں آنے کے بعد سلیم کو تمام باتیں یاد آئیں۔ اور یہ سوچ کر اسکا دل خوشی سے معمور ہو گیا کہ اس نے کم از کم ایک ہی دن کے لیے اپنے دوست کی زندگی بڑھا دی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ زلیخا کے سلسلے میں اسکی بیتابی کا یہ عالم تھا کہ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسی وقت تابوت کا ڈھکن اٹھا کر مصروف خواب کو باہر نکال لیتا۔ سلیم ان دل خوش کن تصورات میں مگن تھا اور ادھر حسین چاند کی خوبصورت اور سیم افشاں چاندنی میں جو وادیٔ بیگمات فرعون میں پھیلی ہوئی تھی پانچوں آدمی مستعدی سے اپنے فرض کی تکمیل کر رہے تھے۔

آج کے حادثے نے عازم الدین کو سب سے زیادہ لرزاں کیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے مصریات سے دلچسپی تھی، اس کو مصر کی قدیم چیزوں سے محبت تھی اور اسکا یہ شوق جنون کی حد تک بڑھ چکا تھا لیکن بہرحال اب وہ عمر کے اس آخری دور میں تھا جہاں پہنچ کر انسان کو ہنگامہ آرائیوں سے نہیں سکون و اطمینان سے پیار ہو جاتا ہے۔ وہ ہرگز ہرگز اس سخت مہم کا پروگرام نہ بناتا لیکن سلیم کو پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے اس نے اس دشوار کام کا بیڑہ اٹھا لیا تھا۔

اس وقت بھی جبکہ وہ مقبرہ کے شمال مغربی گوشے پر ایک پتھر پر

بیٹھا پہرہ دے رہا تھا خیالات و افکار کا ایک ہجوم اس کے دماغ کو پریشان کر رہا تھا ـــــ اس نے اپنے کسی ساتھی کو آج تک یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ بھی اکثر رات کی تاریکیوں میں زلیخا کو لباس مجازی میں کئی بار دیکھ چکا تھا ـــــ اسی زلیخا کو جو اس وقت تابوت میں سو رہی تھی اور جس کی تابوت پر بنی ہوئی تصویر کو دیکھ کر اسکی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا ـــــ اب اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا ـــــ "اگر زلیخا بیدار ہو گئی تو اس کی بیداری کے بعد کیا ہوگا" ـــــ رات بڑھتی گئی اور عازم الدین کی پریشانیاں بڑھتی گئیں ـــــ سامنے حد نظر تک قدیم کھنڈروں کے ویرانے پھیلے ہوئے تھے ـــــ اور چاندنی رات میں ان کے سائے اس طرح گھٹ بڑھ رہے تھے جیسے اس عفریت آباد وادی میں دراز قامت غیر انسانی وجود جھک جھک کر آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں ـــــ

اپنی رائفل کو ایک چٹان کے سہارے لگا کر اس نے سگریٹ سلگایا اور ان پراگندہ خیالات سے اپنے ذہن کو پاک کرنے کی کوشش کی جو اسکو پریشان کر رہے تھے ـــــ لیکن پھر بھی ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا کہ اگر واقعی ان دفن شدہ مصریوں کی روحیں اپنے مقبرہ کی سیر کرنے کے لیے آتی ہوں گی تو ہم سب کو دیکھ کر ان کو کتنا اشتعال آتا ہوگا ـــــ کہ ہم ان کی وادی کے ہیبتناک سکون میں مخل ہو رہے ہیں ـــــ

بہرحال وہ ان ہی خیالوں میں الجھا رہا، ایک لرزہ خیز اضطراب

اس کے دل و دماغ میں انتشاری کیفیت پیدا کرتا رہا، اس کی بے چینیاں بڑھتی گئیں لیکن پھر اس نے خود کو تسکین دیتے ہوئے کہا "کہ اس نے یہاں آ کر تاریخ کے اوراق سے فنا نہ ہونے والے فرعون کے خلاف کوئی علم بغاوت نہیں بلند کیا ہے بلکہ اس کے مشن کی خدمت کی ہے" ـــــ وہ سب اس تاریخی تجربہ کی تکمیل کر رہے ہیں جو ہیکل اعظم کے کاہن نے سیتی اول کے سامنے رکھی تھی اور وہ فرعون کے اس خواب کو ممکن بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں جس کے ذریعہ مصر کا یہ عظیم الشان فرعون مستقبل بعید کے لوگوں کو اپنی شوکت و عظمت کی آنکھوں دیکھی داستان سنوانا چاہتا تھا ـــــ"

چنانچہ اس معقول دلیل سے اس کے بے چین دل کو بہت کچھ سکون ملا اور وہ غیر انسانی خوف جو اس پر غالب آ چکا تھا بتدریج ختم ہونے لگا ـــــ لیکن یہ کیا ـــــ؟ عازم الدین چونک کر کھڑا ہو گیا ـــــ. عفریت آباد وادی سے ایک آواز آ رہی تھی ـــــ شب کی مکمل خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز ـــــ ترنم اور موسیقی میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی آواز ـــــ ایک ایسی آواز جو بالکل غیر متوقع اور بعید القیاس تھی ـــــ عازم الدین کا دل بیٹھنے لگا اور اس کے ہاتھ رائفل کے دستہ پر شکنجہ کی طرح کس گئے، ـــــ پہلے اس نے سوچا کہ شاید یہ آواز اس کے تصور کا کوئی دھوکا ہو ـــــ لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا تھا ـــــ آواز ایک مرتبہ پھر فضا میں پھیلی ـــــ.

وادی میں بالکل سناٹا تھا ـــــ ہر طرف سکوت تھا ـــــ چاند کی روشنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی اور ہوا بھی خاموش ہو کر ٹھہر گئی تھی ـــــ

حرکت کیے، بغیر وہ اپنی جگہ پر ایک ستون کی طرح موجود رہا ــــ اسی طرح آدھا گھنٹہ گذر گیا ــــ اور اب اس نے دیکھا کہ پروگرام کے بموجب حسن اصغر خیریت دریافت کرنے کے لیے اسکی طرف آ رہا ہے ــــ۔

"کہیے عازم الدین صاحب ــــ سب ٹھیک ہے نا ــــ" حسن اصغر نے کہا۔

"ہاں سوائے اس کے کہ ابھی ۴۵ منٹ قبل میں نے ایک عجیب آواز سنی تھی"

"کیسی آواز ــــ؟" حسن اصغر نے پوری دلچسپی سے دریافت کیا اور عازم الدین کے اتنے قریب آگیا کہ وہ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک دیکھ سکتا تھا۔

"ایک عورت کی ترنم میں ڈوبی ہوئی آواز ــــ" عازم الدین نے کہا۔

"اور یہ آواز کس طرف سے آئی تھی ــــ؟" حسن اصغر نے دوسرا سوال کیا۔

"وادیٔ بیگمات کے ان کھنڈروں کی طرف سے ــــ" عازم الدین نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"کیا یہ آواز کسی جوان عورت کی معلوم ہوتی تھی ــــ"

"ہاں ــــ" عازم الدین نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"خوب سمجھ کر جواب دیجیے اس لیے کہ رات کے بہت سے پرندوں کی آواز بھی عورت کی آواز سے مشابہ ہوتی ہے ــــ یا جب کوئی گیدڑ کسی

چھوٹے جانور کو پکڑتا ہے تو اسکی آواز پر بھی نسوانی آواز کا شبہ ہوتا ہے
—" حسن اصغر مسلسل جرح کر رہا تھا۔

"یہ بات میں جانتا ہوں لیکن میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ
کہہ رہا ہوں کہ یہ آواز کسی جانور یا پرندے کی نہ تھی —"

چند لمحات تک حسن اصغر بالکل سکوت کے ساتھ کھڑا رہا — اور اسکے
بعد عازم الدین کا ہاتھ پکڑ کر تیز قدموں کے ساتھ خیمہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

"مجھے کہاں لیے جا رہے ہو حسن اصغر — آخر یہاں پہرے پر کون
موجود رہے گا —" عازم الدین نے احتجاجاً کہا —

"ہمیں جلد از جلد سلیم کے خیمہ میں پہونچ جانا چاہیئے —" حسن اصغر
گھبرا سا گیا تھا پندرہ منٹ کے اندر وہ دونوں سلیم کے خیمہ میں داخل ہو گئے
لیکن سلیم کا بستر خالی پڑا تھا —

ایک عجیب عالم دیوانگی میں دونوں باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ سلیم
تھکے تھکے قدموں کے ساتھ دور وادی کی طرف سے آ رہا ہے — عازم الدین
نے بیٹے کو آتے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی — لیکن حسن اصغر —
وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ آواز کس کی تھی اور سلیم کہاں سے آ رہا ہے !!!

Election being held on 3.1.80

باب ـــــــ ۱۷

آج حتمی طور پر زلیخا کی بیداری کا دن تھا ـــ تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد تمام افراد مقبرہ میں تابوت کے پاس جمع ہو گئے، جیک کے ذریعہ پتھر کا ڈھکنا اٹھایا گیا ـــ ایک مرتبہ پھر سب کی نگاہوں کے سامنے لکڑی کا تابوت موجود تھا ـــ

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے بیداری کے سلسلے میں استعمال ہونے والی تمام چیزیں موجود ہیں ـــ اور میں ناشتہ کے وقت ہر ایک کو بتا چکا ہوں کہ کون آدمی کیا کام کریگا ـــ مثلاً ـــ آخری چراغ میں خود روشن کروں گا ـــ"

"اور میں آپ کے اشارے کا منتظر رہوں گا ـــ جیسے ہی آپ اشارہ دیں گے میں اس مادّے میں، جو خوشبودان میں موجود ہے لوبان کی بتی ڈبو کر

اس کو جلا دوں گا۔" ڈاکٹر بیگ نے کہا۔

"اور میرا کام یہ ہے کہ جیسے ہی شہزادی آنکھیں کھولے میں اس قرابہ میں رکھے ہوئے شربت میں سلسلہ وار رکھا ہوا نمبر ۲ والا سفوف ڈال دوں گا اور تم یہ شربت اسکو پلا دو گے۔" عازم الدین نے کہا۔

"آخری ہدایت یہ کہ اس کو تابوت سے نکال کر جب ہم فرش پر لٹائیں گے اسوقت کوئی آواز نہ ہو۔ کوئی نہ بولے۔ بالکل قبر کا سا سکون رہے۔" حسن اعظم نے کہا۔

اس وقت مقبرہ کا اندرونی منظر واقعی عجیب و غریب تھا۔ ہزاروں سال پرانے شمع دان میں ایک انتہائی قدیم شمع جل رہی تھی۔ اور اسکا دھواں دائیں دروازے سے بل کھاتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ پتھر کے تابوت میں انجیر کی لکڑی کا بنا ہوا کنول نما تابوت ذرا ترچھا رکھا ہوا تھا۔ تپائی پر دو پیالے رکھے ہوئے تھے جن میں کسی قسم کا مرہم تھا، ایک دھات کا بنا ہوا لوبان دان۔ ایک جواہرات سے مرصع پیالی جن میں بھورے رنگ کا کوئی سفوف رکھا ہوا تھا۔ ایک صراحی۔ اور ایک بڑا چراغ۔ جو تپائی پر رکھے ہوئے ایک ایسے برتن میں رکھا ہوا تھا جس کے پائے کسی جانور کی ٹانگ کی شکل کے تھے۔ چھ اور چراغ کچھ کچھ فاصلہ پر رکھے ہوئے تھے۔

طرانی نے ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی وہ شہزادی کو تابوت کے باہر نکالے لوبان جلا دیا جائے۔

اب طہرانی تابوت کے بالکل قریب چلا گیا ــــ اس نے کہا "قبل اسکے کہ میں ڈھکن کھولوں آپ لوگ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ لیں ــــ یہ میری گذارش ہے کہ تابوت کھلنے کے بعد کسی کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلے ــــ"

اور طہرانی کی اس آخری ہدایت کے تحت حسن اصغر نے سلیم کے کان میں کہا ــــ "شہزادی کی بیداری میں اب صرف چند ساعتوں کی دیر ہے ــــ میری التجا ہے کہ آج تم اپنے جذبات پر قابو رکھنا ــــ اور ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ کام خراب ہو بلکہ میں اپنی زندگی کے انتہائی قدیم مشن میں ناکام بھی ہو جاؤں ــــ اور ہاں ــــ میری وصیت پر بھی ضرور عمل کر لینا ــــ"

سلیم نے حسن اصغر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ــــ صرف غور سے اسکی طرف دیکھتا رہا ــــ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آج اُسے کیا کرنا چاہیئے ــــ

تابوت پر جھکا ہوا طہرانی ایک نازک ہتھوڑی کی مدد سے ڈھکن کی کیلیں نکال رہا تھا ــــ مقبرہ میں موجود ہر شخص کا سایہ رنگین دیوار اور خوبصورت چھت پر جم کے رہ گیا تھا ــــ کسی انجانے خوف کے تحت عازم کے چہرے کی سرخی غائب ہو چکی تھی، پروفیسر کی چوڑی پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار تھے اور ڈاکٹر بیگ خاموشی کے ساتھ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی تابوت کے اندر سے ایک زندہ عورت نکلی تو یہ علم طب کا ایک شاہکار کارنامہ ہوگا ــــ لیکن یہ بھی تو ممکن کہ تابوت بالکل خالی ہو ــــ

مقبرہ کی تمازت ہر لمحہ بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

طہرانی کا اشارہ پاکر حسن اصغر تابوت کے سرہانے گیا۔ دونوں نے مل کر تابوت کا ڈھکن اٹھایا۔ اور پھر مقبرہ میں پھیلی ہوئی دھندلی روشنی میں سب نے دیکھا کہ زعفرانی رنگ کے کپڑوں میں لپٹی ہوئی زلیخا جس کا چہرہ ایک سنہری نقاب میں پوشیدہ ہے تابوت کے اندر سو رہی ہے۔

طہرانی نے ایک مرتبہ پھر انگلی کے اشارے سے سب کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور حسن اصغر کی مدد سے زلیخا کا ممیائی شدہ اکڑا ہوا جسم بہت احتیاط کے ساتھ تابوت سے نکال کر زمین پر لٹا دیا۔

عازم الدین نے ایک گہری اور خوفزدہ سانس لی طہرانی قینچی سے زلیخا کے جسم پر کسی ہوئی پٹیاں[1] کاٹنے لگا اور ڈاکٹر بیگ نے خوشبو میں ڈوبی لوبان سلگا دیا۔ ہدایت کے بموجب سلیم نے بھی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دو چراغ جلا دیے۔ اور چراغوں کے تیل کی خوشبو لوبان کی خوشبو میں مل کر کمرے میں پھیل گئی۔

ڈاکٹر بیگ نے جھک کر تابوت میں دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر اس کو مزید حیرت ہوئی کہ اسمیں دستاویز کا کوئی اور چیز موجود ہے۔ طہرانی کی اجازت لیے بغیر اس نے یہ چیز اٹھالی واقعی یہ ایک دستاویز تھی۔ قدیم مصری زبان میں لکھی ہوئی ایک لمبی تحریر۔ طہرانی کے کندھے پر

---

[1] جسم کی ممی بنانے کے بعد اسکو مصالحہ سے بنے ہوئے کپڑے کی پٹیوں سے کس دیا جاتا تھا۔

ہاتھ رکھ کر اس نے اس کو یہ دستاویز دکھائی اور طہرانی نے پٹیاں کاٹنے کا کام ادھورا چھوڑ کر اس کو پڑھنا شروع کر دیا۔

دستاویز میں لکھا تھا۔

"۔۔۔ اے آنے والی نسل کے وہ انسان ۔۔۔ میں فرعون مصر توتمس سوم تجھ سے مخاطب ہوں ۔۔۔

ان فرعونوں کی ہدایت کے بموجب جو مجھ سے پہلے آچکے تھے میں نے بھی اپنی حکومت کے سولھویں برس "میسوری"[1] کے متبرک مہینے کے دسویں دن اپنے باپ دیوتا دار کی تمام دعاؤں کے ساتھ اخناتون مصری کی اولاد زلیخا کا مقبرہ کھولا ۔۔۔ اور یہ دیکھ کر کہ زلیخا واقعی سو رہی ہے اور اس پر دیوی "مائلتا"[2] کا سایہ روز اول کی طرح باقی ہے ۔۔۔

اے وہ انسان ۔۔۔ جس کو میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے میں ملکۂ ارض و سما حطشی پط کا بیٹا نجا اور فرعون زماں توتمس دوم کا بیٹا یہ اس لیے تحریر کر رہا ہے کہ جب تو شہزادی کو بیدار کرے تو اس سے یہ بھی بتا دے کہ توتمس سوم نے عقائد اور نسلی دشمنی کے باوجود محض اس کی اس محبت کی خاطر جو وہ احمس سے کرتی تھی اور اس جذبہ کی خاطر جس کا مظاہرہ اس نے سیتی اول کے تجربہ کی کامیابی کے لیے دکھایا تھا دیگر مقبروں کی طرح اس کے مقبرہ کو کوئی نقصان نہیں پہونچا دیا ۔۔۔ البتہ شاہی خزانے میں

---

[1] "میسوری" قدیم مصریوں کے ایک متبرک مہینہ کا نام تھا ۔۔۔

[2] "مائلتا" زندگی کی دیوی سمجھی جاتی تھی ۔۔۔

اسکا تمام سامان ضرور منتقل کر دیا تا کہ وہ میرے ان بیٹوں کے کام آئے جو مجھے نہ صرف فرعون بلکہ مقدس دیوتا رار کا بیٹا تسلیم کرتے ہوئے میرے آگے سجدہ کرتے تھے۔

زلیخا کا مقبرہ کھول کر اسکو بیدار کرنے والے اے انسان ــــ مجھے نہیں معلوم کہ تو کب اور کس وقت میری حکومت کے کتنے عرصہ کے بعد سیٹی اول کے اس تجربہ کی کامیابی کا اعلان کر دے گا ــــ لیکن میرے دیوتاؤں نے مجھے اتنا ضرور بتایا ہے کہ اس وقت بھی یہ دنیا آباد ہوگی ــــ اور نیل کا پانی اسی طرح مصر کو سیراب کر رہا ہوگا ــــ اس لیے میں اس دستاویز میں خود اپنی تاریخ نقش کروائے دے رہا ہوں تا کہ جہاں تو سیٹی اول اور اسکے مقدس کاہنوں کی عظمت کی داستان بیان کرے ــــ وہاں دنیا کو یہ بھی بتا کہ میں تومس سوم کون تھا ــــ؟

ایک مرتبہ پھر یاد کرے کہ میں تومس سوم جس نے ہزاروں سال تک ایک ہی راستہ پر چلنے والے مصری تمدن کے ہر گوشے، علم و فن، رسم و رواج حتیٰ کہ مصریوں کے مخصوص خدوخال تک کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیا تھا ــــ اپنے خصوصی کاتب "آمخوطپ" سے یہ تحریر لکھوا رہا ہے۔ اور گواہی کے لیے اپنے بیٹے "لوحردا" کو اپنے قریب بٹھا لیا ہے، ــــ

سن ــــ اے زلیخا کو اسکی نیند سے نجات دلانے والے انسان سن ــــ کہ جب میرا باپ تومس دوم مرا تو میری عمر صرف نو برس کی تھی، میری پھوپھی حطشپ پورے مصر کے سیاہ و سفید کی مالک تھی ــــ وہ مجھے دربار میں

ہر وقت ساتھ رکھتی تھی اور اس نے میری کمسنی کے باوجود اپنی چھوٹی بیٹی "حطشپ سط" کی شادی بھی میرے ساتھ کر دی تھی ۔۔۔۔

لیکن مجھے اپنی پھوپھی پر قطعی اعتبار نہ تھا ۔۔۔ اٹھارہ برس کی عمر میں میں نے محل سے فرار اختیار کیا اور دس برس تک ایک مندر میں کاہن کی خدمت انجام دیتا رہا ۔۔۔ اس کے بعد میں برسوں ان دور دراز دلدلی اضلاع میں چھپا پھرتا رہا جو حطشی کی دسترس سے دور تھے ۔۔۔ جلا وطنی کے یہی وہ دن تھے جب میں نے آئین جہانبانی کے اسرار و رموز سیکھے ۔۔۔ اور ایک دن تقدیر آ کر میں نے مصر کی ملکہ "حطشی سط" یعنی اپنی پھوپھی کو سازش کے ذریعہ زہر دے کر مار ڈالا ۔۔۔

مجھے پورا یقین ہے کہ میری پھوپھی ملکہ حطشی سط مجھ سے ایک شفیق ماں کی طرح محبت کرتی تھی لیکن میں اس سے سخت متنفر تھا ۔۔۔ اتنا کہ اکتیس سال کی عمر میں جب میں تخت پر بیٹھا تو میں نے حطشی کی تعمیر کردہ تمام عمارتوں سے ملکہ کا نام تک نکال ڈالا اور یا پھر انھیں مسمار کرا دیا۔

میں نے اپنے دورِ حکومت میں اپنے دشمنوں پر اٹھارہ حملے کیے، میں نے تیس ہزار فوج کے ساتھ "فادموئی"[1] پر حملہ کیا اور صرف نو دن میں ایک سو ساٹھ میل چل کر "غازہ" پر قبضہ کیا ۔۔۔ میں نے کدیشہ فتح کیا اور ۳۳۰ شہزادوں کو قتل کیا اور وہ دولت حاصل کی جو مجھ سے قبل کسی فرعون نے نہیں حاصل کی تھی ۔۔۔

---

[1] فادموئی ۔۔۔ اس علاقہ کو کہتے تھے جو آج فلسطین کہا جاتا ہے۔

میں نے ایسے جہاز بنائے جو سمندر کی سطح پر رتھوں کی طرح چلتے تھے اور ان کا انتظام اپنے ایک سردار "نب آمن" کو سونپ دیا جس نے میرے فوجی کمانڈر "آمن محب" کی مدد سے وہ تمام علاقے بھی فتح کر لیے جو سمندر کے اس پار تھے۔

اے زلیخا کے نجات دہندہ ــــ تو اپنی دنیا کے عالموں اور فاضلوں کو بتا دے کہ میرے دشمنوں نے کبھی مجھ سے آنکھیں نہیں ملائیں اور جنگ میں ہمیشہ لومڑیوں کی طرح میرے مقابلہ پر بھاگ نکلے ــــ

میں نے "اشوریہ"[1] سے بھی خراج وصول کیا اور اپنی فوج کے ساتھ ایک ایسے ملک میں پہونچ گیا جہاں ہاتھیوں کی بے پناہ کثرت تھی، اس ملک میں میں نے ایکسو بیس ہاتھیوں کو شکار کیا اور جب واپس آیا تو اپنے ساتھ تین لاکھ غلام بھی لایا جن کو دیکھ کر میری قوم کو بے انتہا مسرت ہوئی۔

میں نے مصر کو خوشحال بنانے کے لیے اپنے مفتوحہ ملکوں سے سونے اور چاندی کی صورت میں خراج وصول نہیں کیا بلکہ ان سے خوب صورت عورتیں، سنگ تراش اور فنکار مانگے، خراج بطور آئی ہوئی ان عورتوں سے میری قوم نے کرخت، روکھے، خشک اور بارعب مصری بچوں کے بجائے ملائم، نازک، چھوٹی خمیدہ ناک اور ہلکے تبسم والے بچے پیدا کئے۔

اے اس تحریر کو پڑھنے والے انسان ــــ میرے دشمن مجھے خونخوار،

---

[1] اشوریہ ــــ موجودہ عراق کا قدیم نام تھا۔

ظالم اور سنگدل کہتے تھے لیکن ان کا یہ الزام غلط تھا۔ میں انتہائی عفو پرور
رحمدل اور نیک فرعون تھا۔ ایک شریف لیکن بہادر دشمن کی طرح میں اپنے
بدترین دشمنوں تک کو معاف کر دیتا تھا۔ میں نے کبھی بھی اپنے نفس سے
محبت نہیں کی۔ اور اسکا زندہ ثبوت یہ ہے کہ جب میں نے زلیخا کا
تابوت کھولا تو اسکا وہ چہرہ دیکھ کر جو دیوی عشتار سے مشابہ تھا میں اسپر
عاشق ہو گیا۔ لیکن جب میں نے اپنے کاہنوں سے یہ سنا کہ زلیخا
اپنے محبوب کے انتظار میں سیٹی اول کے کسی طبی تجربہ کے تحت سو رہی ہے
تو میں نے اس کو بیدار کر کے اپنی ملکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور
تمام عمر اپنی واحد بیوی "حطشپ سط" پر ہی اکتفا کیا۔

اس لیے اے زلیخا کو جگانے والے نیک انسان۔ میں تو تمس سوم
تجھ سے یہ چاہتا ہے کہ بیدار کرنے کے بعد تو بھی زلیخا کو کوئی تکلیف نہ دے
اور ہر ممکن کوشش کر کے اس کو اس کے محبوب احمس سے ملا دے۔

میری طرف سے اسکا انعام یہ ہے کہ میں نے زلیخا کے تابوت کے
بائیں طرف پانچ قدم چلنے کے بعد فرش سے تین ہاتھ نیچے سونے کے اتنے
ٹکڑے دفن کر دیے ہیں جن کا بوجھ ایک تنہا آدمی نہیں اٹھا سکتا۔

زلیخا کو بیدار کر کے اس کو اس کے محبوب سے ملانے والے اے
نیک دل انسان تجھ پر مصر کے تمام دیوتاؤں کی نوازش کی بارش ہو۔
یہ سونا میں تجھے اپنی طرف سے بخش رہا ہوں۔"

طہرانی نے تحریر ختم کی۔ مسرت بھری نظروں سے عازم الدین کی طرف

دیکھا گویا یہ کہہ رہا ہو کہ مہم کے اخراجات پورے ہونے کے علاوہ ایک ایسی رقم بھی ہاتھ آ رہی ہے جس کا وہم و گمان بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔

وہ پھر زلیخا کے جسم سے ممیائی کی ہوئی پٹیاں کاٹ رہا تھا۔ سلیم نے دیکھا کہ پھٹی ہوئی پٹیوں کے درمیان شہزادی کے نازک اور ملیح شانے چراغ کی روشنی میں چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور ان میں سے نکلتے ہوئے بازو ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے دو کھلتے ہوئے کنول کے پھول۔۔۔ اب طہرانی نے آہستہ سے سنہری زرتار نقاب اس کے چہرے سے ہٹایا اور جیسے ہی سر سے دستار نما بندھے ہوئے رومال کو علیحدہ کیا۔۔۔ بل کھاتے ہوئے سنہرے بال اس کے چاند سے چہرے پر منتشر ہو گئے۔ سب نے غور سے دیکھا۔۔۔۔

نقاب کے پیچھے ایک نرم و نازک سفید چہرہ تھا۔۔۔ خم کھائی ہوئی لمبی پلکیں بند تھیں، رخسار گلاب کی طرح سرخ تھے، ہونٹوں پر ایک بکھری ہوئی ایک مدہوش ہونے والی مسکراہٹ تھی۔۔۔ اور یہ اسی عورت کا سوتا ہوا جسم تھا جس کی تصویر عازم الدین کی لائبریری میں موجود تھی۔۔۔۔

کامل سکوت میں انتہائی ضبط کے باوجود سلیم کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، چمکیلی اور عزم سے بھری ہوئی آنکھوں سے طہرانی نے سلیم کی طرف دیکھا، ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کی تاکید کی اور پھر پروفیسر کی طرف دیکھا جس نے ڈر اور خوف کے تاثرات کے باوجود آخری دو چراغ بھی جلا دیے۔۔۔۔

اب سلیم پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی زلیخا کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی بت

کی طرح خاموش حسن اصغر کی طرف ۔۔۔ اضطراب اور بےچینی کی لہریں اس کے پورے جسم میں دوڑ رہی تھیں، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔۔۔ ابھی زلیخا زندہ ہوگی اور حسن اصغر ہم سب کے سامنے مرکر اس دنیا سے چلا جائیگا، ۔۔۔ ادھر سلیم اس الجھن میں تھا اور ادھر طہرانی اس ضابطہ پر عمل کر رہا تھا جس کی تفصیل قدیم مصری دستاویز میں درج تھی ۔۔۔

تپائی پر رکھی ہوئی شیشی سے ایک سیال مادہ اپنے ہاتھوں میں انڈیل کر اس نے شہزادی کے جسم پر ملا ۔۔۔ پھر اسی تیل میں ایک کپڑا ڈبو کر اس کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا ۔۔۔ اور اسی خوشبو کے دھوئیں سے زلیخا کو دھونی دی ۔۔۔ اس آخری عمل کے بعد اس نے ساتواں اور آخری چراغ بھی روشن کر دیا ۔۔۔

زلیخا بیدار ہونے جا رہی تھی اور عازم الدین میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ہزاروں سال سے سوتے ہوئے جسم کو ایک مرتبہ پھر زندگی کی بھرپور سانسیں لیتے ہوئے دیکھے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے طہرانی سے باہر جانے کی اجازت مانگی ۔۔۔ اور ڈاکٹر بیگ کو ساتھ لیکر بلا آواز قدموں کے ساتھ مقبرہ کے باہر چلا گیا ۔۔۔

"ہوا ۔۔۔ مجھے ٹھنڈی ہوا کی سخت ضرورت ہے" باہر آتے ہی عازم الدین نے ڈاکٹر بیگ سے کہا جس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا ۔۔۔

"پانی پی لیجئے خان بہادر صاحب ۔۔۔" ڈاکٹر بیگ نے یہ کہہ کر

بعد محبت کی قربان گاہ پر زلیخا کی قربانی رائگاں نہ جائے ۔۔۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے خوابوں میں بسنے والی حور طلعت دوشیزہ سے نہ ملتا۔

سلیم نے غور سے زلیخا کی بند آنکھوں کی طرف دیکھا ۔۔۔ نیلی آنکھیں بند تھیں، لمبی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں، سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے ۔۔۔ اور یہ کیا؟ شہزادی کے سینے میں اتار چڑھاؤ شروع ہو گیا ۔۔۔ زلیخا نے ہزاروں سال بعد نئی زندگی کی پہلی سانس لی ۔۔۔ اور پھر ایک نحیف سی آہ کے ساتھ مقبرہ کی خاموشی ٹوٹ گئی ۔۔۔

شہزادی زلیخا نے اپنی آنکھوں کے دلنواز پردوں کو دھیرے دھیرے کیف آفرین سکون سے اٹھایا، اپنے اوپر جھکے ہوئے چہروں کو چند لمحات تک تعجب سے دیکھا ۔۔۔ طہرانی نے لپک کر قرابہ میں رکھے ہوئے شربت میں سفوف ملا کر اس کے سوکھے لبوں سے ملا دیا ۔۔۔ اور بلا کسی توقف کے شہزادی نے اس کے چند گھونٹ پی لیے ۔۔۔

اور پھر کمرے میں ایک ایسی آواز ہوئی جیسے کوئی سوکھا ہوا درخت گر پڑے، جیسے کوئی آہنی ستون پلک جھپکتے میں منہدم ہو جائے ۔۔۔ جیسے کوئی پتھر لڑھک کر نشیب کی طرف چلا جائے ۔۔۔ سلیم، طہرانی اور پرفیسر نے اس غیر متوقع آواز کی طرف دیکھا اور اب ان کے منہ سے بھی ایک چیخ نکل گئی ۔۔۔

حسن اصغر کھڑے کھڑے زمین پر گر چکا تھا ۔۔۔ تھکے ہوئے مسافر کو منزل پر پہنچتے ہی نیند آ گئی تھی ۔۔۔ ایک ہزاروں سال بعد بیدار

ہوئی تھی اور وہ سراہزاروں سال کی بیداری کے بعد نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

آواز مقبرہ کے باہر بھی پہونچی عازم الدین اور ڈاکٹر بیگ بھی دوڑ کر اندر آگئے اور طہرانی رقت آمیز آواز سے بولا "زلیخا بیدار ہو کر زندگی کی سانسیں لے رہی ہے لیکن غالباً حسن اصغر اس ہوش ربا منظر کو دیکھتے دیکھتے بیہوش ہو گیا ہے۔ آپ ذرا اسکی خبر لیں۔ میں جلتے ہوئے چراغ بجھا دوں۔ تاکہ زلیخا اندھیرے میں اپنی پوری آنکھیں کھول سکے۔"

"نہیں۔ ڈاکٹر بیگ۔ حسن اصغر کو ہوش میں لانے کی ضرورت نہیں۔ اسکا وعدہ پورا ہوا۔ اور اب وہ مر چکا ہے۔" سلیم کی آواز اس بے پایاں مسرت کے باوجود جو اسے زلیخا کو بیدار ہوتے دیکھ کر بجھ سی گئی تھی۔ غمزدہ نظروں سے اس نے کبھی زلیخا اور کبھی پتھرائے ہوئے حسن اصغر کی طرف دیکھا۔

زلیخا کی معصومانہ نظریں سلیم کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں اور حسن اصغر کی ساکت و جامد بے نور نظریں دور بہت دور خلا کی طرف دیکھ رہی تھیں جہاں اسکی روح پرواز کرتی ہوئی اپنے اسلاف سے ملنے جا رہی تھی۔

ہر ایک کے لیے حسن اصغر کی اچانک موت ایک اسرار سی بنی ہوئی تھی لیکن سلیم جانتا تھا کہ آج حسن اصغر نہیں۔ گیتا ری مرا ہے۔ وہ گیتا ری جس کی طویل زندگی کا واحد مقصد زلیخا کی بیداری تھا۔ لیکن وہ

کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لرزتے ہوئے آنسوؤں کی دو بوندیں اسکی آنکھوں میں چھلکیں اور اس نے حسن اصغر کے بے جان ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیکر کہا۔

"خدا حافظ دوست ۔۔۔ خدا حافظ۔"

اور ان سب باتوں سے بالکل بے نیاز زلیخا اب بھی سلیم کی طرف تھکی تھکی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے نیلی آنکھیں طبعی نیند سے بوجھل ہونے لگیں ۔۔۔ اور چند لمحات کے بعد وہ پھر سو گئی۔

قدیم مصر کی تاریخ کے دونوں کردار سو چکے تھے لیکن ایک کی نیند زندگی سے بھرپور تھی اور دوسرے کی نیند موت سے لبریز ۔۔۔

"شہزادی اپنی طبعی نیند سو رہی ہے اور غالباً ایک گھنٹے میں مکمل طور سے بیدار ہو جائے گی ۔۔۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ ہم حسن اصغر کی لاش لیکر باہر چلیں ۔۔۔" طہرانی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں آقائے طہرانی ۔۔۔ مجھے حسن اصغر کی وصیت پر عمل کرنا ہے۔" سلیم نے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"کیسی وصیت؟" طہرانی اور عاذم الدین دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"اس کی وصیت تھی کہ اسے شہزادی کے تابوت میں ہی لٹا دیا جائے اور پتھر کا ڈھکن بند کر دیا جائے ۔۔۔ آج کے بعد یہ شہزادی زلیخا کا نہیں حسن اصغر کا مقبرہ ہے۔"

"لیکن کیسے ۔۔۔؟" طہرانی نے کہا۔

"یہ ایک لمبی داستان ہے جو میں یہاں نہیں بیان کر سکتا۔ اس لیے میری بات کا یقین کیجئے اور قبل اس کے کہ زلیخا مکمل طور سے بیدار ہو مجھے حسن اصغر کی وصیت پر عمل کر لینے دیجئے۔"

"تو کیا تمھیں اسکا پہلے سے علم تھا کہ حسن اصغر مر جائے گا۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہم دونوں یہ بات جانتے تھے۔ اور یہ رہا اسکا ثبوت" یہ کہہ کر سلیم نے حسن اصغر کی مصری عبا الٹ دی۔

عبا کے اندر حسن اصغر کفن پہنے ہوئے تھا۔

"ہر ایک چیز اسرار ہے، معمہ ہے، سحر ہے۔ خدا کی قسم میں پاگل ہو جاؤنگا۔" ڈاکٹر بیگ نے آہستہ آہستہ کہا۔ اور پھر سب نے مل کر حسن اصغر کی لاش زلیخا کے تابوت میں لٹا دی۔ پتھر رکھنے کا آلہ ایک مرتبہ پھر حرکت میں آیا اور پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے تابوت بند ہو گیا۔

سنگی تابوت پر سلیم کی آنکھ سے آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپکیں اور وہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

—o—o—o—

باب ـــــــــــــــ ۱۸

کمرے میں ایک عجیب قسم کی نیم مردہ خاموشی طاری تھی۔

سنگی تابوت میں حسن اصغر کی لاش بند کی جا چکی تھی، سامنے زمین کے فرش پر زلیخا اپنی طبعی نیند سو رہی تھی، ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر ارشد پر سکتہ سا طاری تھا، بے پایاں تصورات کے اژدہام کی وجہ سے انکا دل و دماغ حسن اصغر کی اچانک موت اور زلیخا کی طے شدہ بیداری کے اس زندہ معجزہ کو قبول کرنے کی صلاحیت کھو چکا تھا ـــــ عازم الدین گردن جھکائے بیٹھا تھا طہرانی کے چہرے پر سکون بھی تھا اور تفکر بھی اور سلیم ـــــ وہ اپنے دوست کے تابوت پر سر رکھے اب بھی آنسو بہا رہا تھا۔

ڈاکٹر بیگ کا کیمیاوی دماغ زلیخا کو اپنی آنکھوں سے بیدار دیکھنے کے باوجود یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟ ایک لڑکی فرعون سیٹی اول کے

دورِ حکومت میں زندہ تھی، ایک لڑکی جو دوشیزگی کی عمر سے گذر چکی تھی ـــ اسکی زندہ ممی بنائی گئی، تاریخی حساب کے اعتبار سے اس کی عمر تین ہزار پانچ سو برس سے زائد تھی لیکن ـــ اس وقت بھی اسکی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی ـــ ماضی اور حال کی اس طویل مدت نے اس کے چہرے کی شگفتگی پر جسم کے نکھار پر ـــ آنکھوں کی چمک پر ـــ رخساروں کی تابندگی پر اور لبوں کی تازگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا ـــ

ڈاکٹر بیگ نے سوچا ـــ آخر ـــ وہ کون سے نامعلوم کیمیاوی اصول تھے جس نے اس طبی معجزہ کی تخلیق کی ـــ اس کا مطلب یہ ہے کہ طب اور سائنس کی آج تک کی جدوجہد بالکل بے معنی ہے ـــ وہ کتابیں جو اس مضمون پر لکھی گئی تھیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے قابل ہیں ـــ وہ تمام تجربہ جو حیاتِ انسانی پر آج تک مختلف دور کے حکما نے کئے تھے وہ سب غلط تھے ـ اور صحیح تھا تو سیٹی اوّل کا طبی مشیر ـ یا ہیکل راکا کاہن اعظم ـــ جس نے ہزاروں سال گذرنے کے بعد بھی زیلیتھا کی روح اور اس کے جسم دونوں کو باقی رکھا اچانک ایک سوال اس کے ذہن میں ابھرا ـــ کیا شہزادی زیلیتھا غیر طبی عناصر سے تو نہیں بنی ہے ـــ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سحر ہو" اور یہ سوچتے ہی ڈاکٹر بیگ کے جسم میں ایک جھرجھری سی آگئی ـ

لیکن بہرحال یہ سب پراگندہ خیالات تھے جو اس کے ذہن میں بار بار کلبلا رہے تھے اور وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ پا رہا تھا ـــ

ڈاکٹر بیگ مادّہ پرست تھا ـــ اس کا یقین تھا کہ دنیا میں صرف مادّہ

ہے اور ایک ایسی قوت کا نام ہے جو انسان تو انسان نباتات و جمادات تک میں موجود ہے مغربی تعلیم نے اس کے ذہن کو روحانیت سے قطعی دور کر دیا تھا۔ ورنہ اس وقت جبکہ اس نے اپنی آنکھوں سے زلیخا کو ہزاروں برس کی نیند سے بیدار ہوتے دیکھا تھا اسے کوئی تعجب نہ ہوتا اور اس ناقابل یقین بیداری کو بھی قدرت خداوندی کا ایک مظہر کہتا۔

ڈاکٹر بیگ اگر مادہ پرست نہ ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ انسان علم و کمال کے انتہائی درجہ پر پہنچنے کے باوجود اپنی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن خود کو نہیں دیکھتا۔ اس نے اپنی استعداد داخلی کو غفلت کا زہر پلا کر مردہ کر رکھا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر خوابیدہ قوتیں بیدار ہونے کے بجائے اس کے لئے حجاب بن کر رہ گئیں اور وہ جو ماضی حال مستقبل سب کچھ جان سکتا تھا صرف امروز کے ہنگاموں میں اس طرح پھنس کر رہ گیا ہے کہ اس کی نگاہ بصیرت تک تاریکی میں ڈوب گئی۔ لیکن تابوت میں موت کی ابدی نیند سونے والے حسن اصغر کو یہ راز معلوم تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس پوری کائنات میں تغیر و تبدل کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہے، یہاں کی کوئی شے ایک حالت اور ایک صورت میں نہیں قائم رہ سکتی۔ ہر بقا کو فنا ہے، ہر ذی روح کی تخلیق کا ایک مقصد ہے، اور ہر قلب میں ایک ایسا جوہر ودیعت ہو چکا ہے کہ اگر اسے بیدار کر لیا جائے تو فنا و بقا، عدم و وجود۔ موت اور زندگی کا ہر حجاب اٹھ جائے۔

ڈاکٹر بیگ کو یہ راز نہیں معلوم تھا کہ ہر فنا میں بقا رہے، ہر موت میں

زندگی ہے ـــ اور جب کوئی پچھلی صورت معدوم ہوتی ہے تو ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد ایک نئی صورت ضرور پیدا ہوتی ہے ـ جدید سائنس کے نام پر روحانیت اور ربّانیت کے اصولوں کو فراموش کر دینے والے مادہ پرست انسانوں کی طرح زیلیتھا کی ناممکن بیداری پر حیرت زدہ ڈاکٹر بیگ بھی الٰہیات کا یہ پہلا درس بھول چکا تھا کہ اللہ نے ہر انسان کے دل میں اپنی ایک امانت ودیعت کی ہے ـــ اور یہ امانت وہ جوہر لطیف ہے جس کا بار اٹھانے سے زمین آسمان حد یہ کہ پوری کائنات نے انکار کر دیا تھا ـــ جوہر لطیف ـــ یعنی روح ـ جس کا ہلکا سا عکس دنیا میں پائے جانے والے ہر مادّہ کے ساتھ ضرور پایا جاتا ہے ـــ جیسے پھول میں خوشبو، ستاروں میں نور، ہوا میں تموّج ـــ پانی میں روانی ـــ جسم میں حرکت ـــ لیکن انسان کا جوہر لطیف ـــ ایک ایسی روح ہے جس کی دست رس آسمان تک ہے ـ بلکہ آسمان کے بھی آگے ـــ جو ازلی اور ابدی ہے ـ جو ایک بسیط جوہرِ واحد ہے اور جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی ـــ

پھر اگر زیلیتھا کی روح بھی باقی رہی تو اس میں حیرت کی کیا وجہ تھی ـ؟

ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر ارشد دونوں کا اندازِ فکر ایک تھا ـــ لیکن زیلیتھا کی بیداری کا منظر دیکھ کر وہ بھی غیر اعتقادی مسائل پر اعتقاد کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ـ ورنہ حقیقتاً وہ پاگل ہو جاتے زندگی میں پہلی بار انھوں نے دل ہی دل میں روح کی لافانی عظمت کا اقرار کر لیا ـ

اب زیلیتھا اپنی طبعی نیند کے دوران میں ایک زندہ انسان کی طرح

باقاعدہ سانسیں لے رہی تھی ـــــ اور کمرے میں ایک پراسرار خاموشی مسلط تھی۔
لیکن بہرحال یہ اکتا دینے والی خاموشی ٹوٹی اور طہرانی نے ڈاکٹر بیگ سے کہا۔
"ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ زلیخا کے جسم کا معائنہ کرلیں ـــــ تاکہ اب بھی
اگر کوئی کمی ہو تو ان سے جدید طب کی روشنی میں پورا کرلیا جائے۔"

کانپتے ہوئے ہاتھوں اور کپکپاتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر نے زلیخا کے جسم
کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "حیرتناک ـــــ رب حقیقی کی قسم حیرتناک ـــــ
ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میری مستند رائے یہ ہے کہ زلیخا کی نبض، اس کا
تنفس اور حرارت جسمانی غرضکہ ہر چیز اعتدال پر ہے۔ اس کا گوشت قطعی طور
پر صحت مند ہے دانت بالکل صحیح و سالم ہیں خون کی رفتار ایک تندرست
انسان کی طرح اپنی صحیح رفتار پر ہے۔ اور سوائے اس کے کہ اس کے سینہ
پر بائیں جانب زخم کا ایک چھوٹا سا نشان ہے اس کا جسم بھی بالکل مکمل اور
صاف ہے ـــــ"

"غالباً زخم کا یہ چھوٹا سا نشان اس عمل جراحی کی یادگار ہے جو فرعون کے
حکمار نے اس کے جسم پر ایک مسلسل نیند سلانے کے لئے کیا تھا۔" طہرانی
اپنی رائے دی۔

"یقیناً آپ کا خیال درست ہے ـــــ" ڈاکٹر بیگ نے کہا ـــــ میں اس
نتیجہ پر بھی پہنچا ہوں کہ زلیخا اب صرف اس نیند میں ہے جو انتہائی تھکن کے بعد ہر
انسان کو آجاتی ہے، وہ بالکل زندہ ہے طہرانی ـــــ حالانکہ میرے عقائد و تجربات
کی روشنی میں اسے ہزاروں سال پہلے ہی مرجانا چاہیئے تھا۔ جبکہ یہ حقیقت

ہے کہ آج اس کے متعلقین میں سے ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو صدیوں پہلے فنا نہ ہو چکا ہو ــــ"

اور ڈاکٹر بیگ کی زبان سے یہ بات سنتے ہی سلیم کا دل چاہا کہ وہ اسوقت سب کو بتا دے کہ زلیتھا کے متعلقین میں سے آخری فرد ابھی زندہ ہے اور وہ وہی ہے جس کی خاطر اس نے سیٹی اوّل کے تجربہ کے لئے خود کو پیش کر دیا تھا۔ جس کی زندگی صدیاں گذرنے کے باوجود ختم نہ ہوئی ــــ صرف داستان کا ایک باب ختم ہوا دوسرا باب شروع ہوتا رہا ــــ لیکن سلیم چونکہ غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے تحت کسی بحث کے لئے تیار نہ تھا اس لئے وہ سب کچھ کہنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

دراصل وہ خود ایک شدید الجھن میں تھا۔

اُسے اپنا گزشتہ ماضی یاد آ رہا تھا ــــ وہ روح پرور لمحات یاد آ رہے تھے جب زلیتھا نے جبکہ وہ جنگ پر جا رہا تھا اپنی نیلی آنکھوں کی گھنی پلکوں کو آہستہ آہستہ اٹھا کے اپنی محبت میں سرشار نظروں سے آخری بار دیکھا تھا اور کہا تھا ــــ "اجمس ــــ میں تمہاری واپسی کا انتظار کرونگی ــــ رہتی دنیا تک۔ قیامت تک ــــ اپنی زندگی کی آخری سانس تک ــــ"

سلیم نے سوچا ــــ "آج سے چند ماہ پہلے تک اسے کچھ بھی نہ معلوم تھا ــــ نہ اپنے بارے میں ــــ زلیتھا کی مسلسل نیند کے بارے میں اور نہ اپنے دوست گیتاری کے بارے میں ــــ لیکن سرزمین مصر پر قدم رکھتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس مٹی کی خوشبو وہ پہلے بھی سونگھ چکا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ــــ؟ زندگی

نے اتنا طویل سفر کیسے طے کر لیا ۔۔؟

سلیم کی آنکھیں اور بڑھتیں ۔۔۔ لیکن اس نے دیکھا کہ زلیخا نے ایک گہری سانس کے ساتھ بالکل اس انداز سے کروٹ بدلی جیسے وہ اٹھنے کے لئے تیار ہو رہی ہو ۔۔ اس کی تمام تر توجہ ۔۔ زلیخا کی طرف مبذول ہو گئی اور پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی ۔۔"

Salig wand Mullo

سب تو سب ۔۔۔ خود طہرانی بھی یہ منظر دیکھ کر ڈر گیا ۔۔

وہ عورت جو ہزاروں سال سے ایک بند تابوت میں محبوس تھی ۔۔ وہ عورت جس کے جسم کو ایک ناقابل تصور عمل جراحی کے ذریعہ زندہ ممی میں تبدیل کر دیا گیا تھا ۔۔۔ وہ عورت جس نے صدیوں سے نہ آفتاب کی روشنی دیکھی تھی اور نہ تاروں کی چمک ۔۔ اور وہ عورت جسکو ابھی دو گھنٹے قبل اُن سب نے موت سے ملتی جلتی نیند میں ڈوبے دیکھا تھا ۔۔ ان کے سامنے زندگی اور جوانی کی بھرپور انگڑائی لے کر حیرت زدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اے قاہرہ کے عجائب گھر کی زینت بڑھانے والی سیٹی اول کی لاش۔

تیرا تجربہ کامیاب رہا ۔۔ تو نے ہزاروں سال قبل جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر مل گئی ۔۔ تیرے حکیم اپنے علم و فن کی بنیاد پر طب کی دنیا میں جو انقلاب لانا چاہتے تھے وہ آ گیا ۔۔۔ تو مہذب اور سائنس پرست دنیا پر قدیم دنیا کی ترقی و کامرانی کا جو پرچم لہرانا چاہتا تھا وہ بہر حال سربلند ہو گیا۔

اب زلیخا کی حیران نظریں سلیم کی طرف گھومیں ۔۔ ایک کنواری اور

شبنم سے دھلی ہوئی معطر مسکراہٹ اسکے لبوں پر پھیلی ـــ رخساروں پر ڈوبتے آفتاب کی کرنوں نے والہانہ رقص کیا اور مقبرہ کے کمرے میں زلیخا کے لبوں سے نکلنے والی پہلی نغماتی آواز گونجی ـــ "احمس ـــ دیکھو میں جاگ گئی ـــ"

اور عازم الدین کو یاد آگیا ـــ یہ نغماتی اور ترنم میں ڈوبی ہوئی آواز وہ کل رات کو بھی سُن چکا تھا ـــ بالکل ایسی ہی آواز ـــ جو وادیٔ بیگمات فرعون کی طرف سے آرہی تھی ـــ

"گیتاری کہاں ہے ـــ؟" کمرے میں ایک مرتبہ پھر ترنم بکھر گیا ـــ

"تھک کر گہری نیند سو رہا ہے زلیخا ـــ" سلیم نے جواب دیا۔

"مجھے سخت گرمی لگ رہی احمس ـــ آؤ باہر چلیں ـــ" اور ایک سحر زدہ مجسمہ کی طرح اپنے مرمریں ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں میں سلیم کی انگلیاں پھنسا زلیخا اس طرح مقبرہ کے مختلف دروازوں سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی جیسے وہ ان تمام راستوں سے بخوبی واقف تھی ـــ

"کیا میں یقین رکھوں کہ سلیم کی جان محفوظ رہے گی ـــ" عازم الدین نے گھبرا کے طہرانی سے پوچھا ـــ

"سلیم نہ کہو عازم الدین احمس کہو ـــ اور یاد رکھو کہ آج کے بعد وہ تمہارا بیٹا نہیں زلیخا کا بچھڑا ہوا محبوب ہے ـــ" طہرانی نے فوراً جواب دیا ـــ

"لیکن اس وقت وہ گئے کہاں ہیں ـــ؟" عازم الدین کے لہجے میں بدستور ایک ایسی پریشانی مضمر تھی جو صرف ایک باپ ہی اپنے بیٹے کے لئے محسوس کر سکتا ہے ـــ

"وہ کہیں بھی گئے ہوں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ شام تک خیمہ میں ضرور واپس آجائیں گے، ــــ اس لئے آؤ ہم بھی باہر چلیں ــــ ہمیں شہزادی کے لئے ایک علیحدہ خیمہ کا بھی بندوبست کرنا ہے" طہرانی نے کہا۔

"صرف ایک سوال طہرانی ــــ اور اس کے بعد میں دہلی کی واپسی تک بالکل خاموش رہوں گا۔" ڈاکٹر بیگ نے طہرانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، "حسن اصغر کی موت اور زلیخا کی بیداری میں کونسا رشتہ تھا ــــ؟"

"خدا کی قسم میں کچھ نہیں جانتا ــــ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ حسن اصغر کا وجود ایک معمہ ضرور تھا ایک ایسا معمہ جسے سلجھانا ہماری فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ حسن اصغر کیا تھا ــــ؟ کون تھا ــــ؟ اور اس نے آج صبح سے ہی کفن کیوں پہن رکھا تھا ــــ؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب کم از کم میرے پاس نہیں ہے ــــ" طہرانی نے رک رک کر کہا۔

"تو کیا حسن اصغر کا وجود ہم سب کے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہے گا۔؟" ڈاکٹر بیگ نے پوچھا۔

"نہیں ــــ ہم سب یہاں سے اس کے خیمہ کی طرف جائیں گے شاید اس کے سامان میں ہمیں کوئی مطلب کی چیز مل جائے ــــ" طہرانی نے جواب دیا اور حسن اصغر کے تابوت پر الوداعی نظریں ڈال کر باہر نکل آیا ــــ"

سورج غروب ہونے میں ابھی کافی دیر تھی ــــ خلاف معمول آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے، ہوا رقص کرتی ہوئی چل رہی تھی ــــ، ماحول میں ایک ترنم سا بکھرا ہوا تھا ــــ، اور سرت میں ڈوبی ہوئی فضا

پکار پکار کر پارٹی کے ہر فرد کو خوشی اور مسکراہٹوں کی دعوت دے رہی تھی لیکن بے مثال کامیابی کے باوجود ــــ سب مضمحل تھے، اداس تھے، غمزدہ تھے اور ہر شخص کا دل اگر ایک طرف حسن اصغر کی اچانک موت پر حیران و پریشان تھا تو دوسری طرف ان کے اعصاب پر ایک انجان خوف بھی مسلط تھا ــــ سب کی آنکھیں ایک دوسرے سے سوال کر رہی تھیں، اور یا پھر دور گھاٹیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں جدھر زلیخا اور سلیم کے قدم اٹھے تھے ــــ

تھکے تھکے قدموں کے ساتھ سب لوگ اپنی قیام گاہ تک آئے، پروفیسر اور عازم الدین تو اپنے خیموں کی طرف چلے گئے لیکن طہرانی کے اشارے پر ڈاکٹر اس کے ساتھ حسن اصغر کے خیمہ میں داخل ہو گیا ــــ

خیمہ کا سامان اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے حسن اصغر ابھی اٹھ کر کہیں باہر گیا ہو ــــ ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی، ہر شے میں ایک سلیقہ تھا ــــ طہرانی نے غور سے خیمہ کے تمام سامان پر ایک گہری نظر ڈالی اور پھر اس کی نظر اس میز پر ٹھہر گئی جو خیمہ کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی تھی ــــ میز پر ایک کتاب کھلی ہوئی تھی ــــــــ اور یہ کتاب اس طرح رکھی تھی جیسے حسن اصغر نے اس کو پڑھتے پڑھتے اچانک چھوڑ دیا ہو ــــ لیکن جب طہرانی نے نزدیک آ کر اس کتاب کو اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس نے کسی فوری جذبہ کے زیر اثر ڈاکٹر بیگ سے کہا ــــ "ڈاکٹر ــــ تم نے مقبرہ میں مجھ سے اپنا آخری سوال کیا تھا ــــ تم حسن اصغر کا وجود جاننا چاہتے تھے ــــ تم چاہتے تھے کہ تمہیں یہ راز معلوم ہو جائے کہ حسن اصغر کیوں مرا ــــ لو ــــ اس کتاب

میں تمہارے سوال کا مکمل جواب موجود ہے ۔ یہ کتاب نہیں حسن اصغر کی پوری سوانح حیات ہے جو وہ اپنی زندگی کے مختلف دور میں لکھتا رہا اور جس کا آخری باب اس نے آج صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے قبل ختم کیا تھا ۔"

"یعنی ۔۔۔ یہ ایک قلمی کتاب ہے ۔" ڈاکٹر بیگ نے پوچھا ۔

"ہاں ۔۔۔ اور چونکہ میرے خیال میں اس کا آخری باب ہی انتہائی دلچسپ ہوگا اس لئے میں وہی سب سے پہلے پڑھونگا ۔۔۔ سنو ۔۔۔ اور پھر فیصلہ کرو کہ حسن اصغر کو ہم کیا سمجھتے تھے لیکن درحقیقت وہ کیا تھا ۔۔۔؟"

اب طہرانی نے اس قلمی کتاب کا آخری باب پڑھنا شروع کیا ۔

"میرا وجود ایک کڑی ہے جو حال اور ماضی کو ملاتی ہے ۔۔۔ ایک ایسا چراغ ہے جس پر تاریکی قبضہ نہیں کر سکتی ، ہوا کے جھونکے نہیں بجھا سکتے کیونکہ اس میں وفا کا تیل ڈالا گیا ہے اور اسے میری قوت ارادی نے روشن کیا ہے ۔ لیکن وقت آگیا ہے کہ میں خود ہی پھونک مار کر اس چراغ کو بجھا دوں ۔۔۔

میں نہیں چاہتا کہ زلیخا کی بیداری کے بعد میری روح ایک بے آواز نغمہ بنکر رہ جائے ۔ میں اپنی روح کے اس طویل سفر کی داستان جو آج سے تقریباً ۳½ ہزار سال قبل شروع ہوئی تھی اس کاغذ پر نہیں لکھ سکتا ۔۔۔ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ لوگ اس پر یقین نہیں کریں گے ۔۔۔"

میں یہ داستان کسی کو سنا بھی نہیں سکتا کیونکہ میرے ارد گرد ایسا

کوئی انسان نہیں ہے جس کے پاس ظاہری بینائی کے علاوہ باطنی آنکھیں بھی ہوں ۔ اس لئے میری خاموشی ہی بہتر ہے۔ سچائی بہر حال سچائی ہے۔

میں سوچتا ہوں ۔ مجھے اس کا کیا حق حاصل ہے کہ میں قدرت کے سربستہ راز کھول کر اس مادہ پرست دنیا کے سامنے تماشہ بن جاؤں۔

مجھے معلوم ہے کہ کوئی نہ کوئی انسان میرے جانے کے بعد اس کتاب کو پڑھے گا ۔ اس لئے میں اس پڑھنے والے کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس دنیا میں ہزاروں سال سے موجود تھا ۔ "میری زندگی کا ایک سلسلہ جاری تھا لیکن جس طرح ہر بقا کو فنا ہے اسی طرح کل دو پہر ڈھلنے کے بعد میں بھی فنا ہو جاؤنگا اور میرے بعد میری زندگی کی داستان یا پھر میری یہ تحریر ہی باقی رہ جائے گی ۔

میں نے ہزاروں سال تک یہ دنیا اور اس دنیا کے گوشے گوشے میں بسنے والے انسانوں کو دیکھا ہے ۔ میں نے چین میں کنفیوشش کی تعلیم سنی ہے ۔ میں نے گوتم بدھ کو جہالت اور انسانی دکھوں کے خلاف تقریر کرتے دیکھا ہے ۔ میں نے عیسیٰ کو صلیب پر لٹکتے دیکھا ہے ۔ میں نے بابل کی شان و شوکت دیکھی ہے ۔ میں نے رومتہ الکبریٰ کی عظمت کا مشاہدہ کیا ہے ۔ میں نے اسیریا کے روحانی پیشواؤں کا مباحثہ سنا ہے ۔ میں نے یونان کے فلاسفروں کے نصب العین کا مطالعہ کیا ہے۔

الغرض میرا دماغ خیالات سے پُر ہے ۔ میرا جسم بیحد پرانا ہو چکا ہے لیکن روح ابھی بالکل تر و تازہ ہے ۔ میں تھکتا جا رہا تھا ۔

بیحد پرانا ہو چکا ہے لیکن روح ابھی بالکل تر و تازہ ہے۔ میں تھکتا جا رہا تھا۔ میں سو جانا چاہتا تھا لیکن زلیخا کی بیداری کے بغیر یہ بالکل ممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے بیحد ریاضت کی ــــ، اور ایسے راستے دریافت کئے جن کے ذریعہ میں زلیخا کی روح تک پہنچ گیا ــــ،

میں نے زلیخا کی بیداری کے انتظامات کئے اور اللہ کے حکم سے جو اس دنیا کا خالق ہے اور جس کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ــــ

اب مجھے پورا یقین ہے کہ زلیخا بیدار بھی ہو جائے گی اور اس کا محبوب بھی اسے مل جائے گا ــــ، مجھے اسپاتا کی طرف سے خطرہ تھا اور اب بھی ہے ــــ لیکن میں کیا کروں کسی کو فنا کرنا میرے اختیار میں کبھی نہیں ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اسپاتا کی خبیث روح زلیخا اور احمس کو کوئی نہ کوئی نقصان ضرور پہنچائے گی ــــ لیکن میں ان دونوں کی سلامتی اور زندگی کی دعا مانگنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا ــــ کیونکہ میرا سفر ختم ہو چکا ــــ اب مجھے اپنی موت کا استقبال کرنا ہے ــــ میری روح اور میرا تھکا ہوا جسم اب صرف اپنی موت کا منتظر ہے ــــ

میں زندگی کی ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دینا چاہتا ہوں جن کی بندش اور بوجھ سے میں تھک چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ موت کا فرشتہ مجھے اپنے دامن میں چھپا لے اور پھر مجھے وہاں لے جائے جہاں میرے آباؤ اجداد کی روحیں موجود ہیں اور روز قیامت کا انتظار کر رہی ہیں ــــ

میرا یقین کامل ہے کہ خدا سے عظیم تر کوئی مالک اور سلطان نہیں۔
کا خالق ہے وہی سب کا مالک ہے ۔ اسی سے سب کی ابتدا ہے اور
اسی تک سب کی انتہا ہے ۔ وہی سلطان السلاطین ہے اور وہی ملک الملوک
اس کی عظمت سب سے بالاتر ہے اور وہی کُل اکابر سے اعظم و اکبر ہے ۔

میں جانتا ہوں کہ میری روح کے اس طویل سفر پر دنیا بہت حیران
ہوگی لیکن خدا کے حکم سے سب کچھ ممکن ہے ۔ روح کے مسئلہ پر ہمیشہ سے
ایک پردہ پڑا ہوا ہے ، اس کی حقیقت کوئی بھی نہیں جان سکتا ۔ روح
کو جب حواس ظاہری سے محسوس نہیں کیا جا سکتا تو اس کی حقیقت و ماہیت
کو بھی نہیں سمجھا سکتا ۔

اور اسی لئے میں بھی چاہتا ہوں کہ میری اس طویل زندگی کا راز بھی
ایک راز ہی رہے اور دنیا یہ نہ جان سکے کہ میری روح اتنے طویل عرصہ
تک اپنے جسم میں کیسے رہی ۔ ؟

بہر حال ۔

اے اس دنیا کی رنگینی اور مسرت ۔ الوداع

اے مصر کی شہزادی . . . . . الوداع

اے میرے دوست احمس . . . . . الوداع

قلمی کتاب کی آخری سطریں پڑھنے کے بعد طہرانی نے ڈاکٹر بیگ کی طرف
دیکھا جو خیالات میں گم حسن اصفر کی یہ آخر تحریر سن رہا تھا ۔ اور جس کے
ذہن میں بار بار حسن اصفر کی تصویر ابھر رہی تھی معصوم اور پاکیزہ تصویر ۔

صاف اور واضح تصویر ۔

"آؤ دوست چلیں ۔۔۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے، اس کا گوشہ گوشہ اسرار سے بھرا ہوا ہے، قدم قدم پر پیچیدگیاں ہیں ۔۔۔ اور ایسے معمے ہیں جن کو ہمارا دماغ حل نہیں کر سکتا ۔۔۔ اب یہی دیکھو کہ زلیخا بیدار ہوتے ہی سلیم کو لیکر وادی کی طرف چلی گئی ۔۔۔ کیوں گئی، کس لئے گئی اور وہاں اب تک کیا کر رہی ہے ۔۔۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم ۔۔۔" طہرانی نے کہا۔

"لیکن سلیم کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے ۔۔۔" ڈاکٹر بیگ نے بیچین ہو کر پوچھا ۔۔۔

"حسن اصغر کی آخری تحریر کے بموجب ان دونوں کی جان کو کوئی نہ کوئی خطرہ ضرور ہے ۔۔۔ لیکن ہم ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں ۔۔۔" طہرانی نے ٹھنڈی سانس لے کر یہ جملہ کہا اور پھر دونوں اپنے خیموں کی طرف چلے گئے ۔۔۔

تمت

باب ــــــــ ۱۹

ادھر عازم الدین اور طہرانی اپنے اپنے خیموں میں سلیم اور زلیخا کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے اور ادھر یہ دونوں عاشق و محبوب دور بہت دور وادیٔ بیگمات مصر میں ایک قدیم مندر کے کھنڈرات میں کھڑے ہو کر اس گفتگو کو مکمل کر رہے تھے جو فرعون مصر سیٹی اوّل کے دور حکومت میں نامکمل رہ گئی تھی ۔

زلیخا باغ کے کسی تر و تازہ پھول کی طرح بالکل شگفتہ تھی اس کے لبوں پر ایک لافانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی محبت انگڑائیاں لے رہی تھیں جس پر دنیا جہاں کی محبتیں نچھاور کی جا سکتی تھیں ۔ دونوں اس کھنڈر کے بالکل وسط میں کھڑے تھے ــــ

زلیخا نے نغمگیں آواز سے سلیم کو مخاطب کیا ــــ "کتنے طویل انتظار کے بعد تم مجھے ملے احمس ــــ افناتون کی مقدس روح کی قسم ــــ انتظار اپنی آخری حدیں بھی پار کرتا جا رہا تھا ــــ"

اور سلیم نے کہا "زلیخا ــــ میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی جب پہلی بار میں نے تمہاری تصویر کو اپنی لائبریری کے کمرے میں دیکھا تو مجھے ایسا ضرور محسوس ہوا کہ میں ــــ"

"میں سب جانتی ہوں ــــ اس لئے ماضی کی بات کرنے کے بجائے اب ہم اپنے مستقبل پر بات کریں، اپنی نئی زندگی کا منصوبہ بنائیں، اور یہ فیصلہ کریں کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے ــــ تم جانتے ہو احمس ــــ اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں ــــ" زلیخا نے سلیم کی بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں ــــ ہم توتمس سوئم کے بنائے ہوئے ایک عظیم الشان مندر کے کھنڈروں میں کھڑے ہیں ــــ" سلیم نے مسکرا کر کہا۔

"یہ وہ مندر ہے جو توتمس سوئم نے نہیں ــــ مصر کی پہلی ملکہ حطشی نے بنوایا تھا ــــ اس کی لمبائی آٹھ سو فٹ تھی، دروازے پیتل اور چاندی کے تھے ــــ پوری عمارت سنگ سرخ کے چار مہیب ستونوں پر کھڑی رہتی تھی۔ اور اس کے دروازے پر دیوتاؤں کے یہ الفاظ کندہ تھے ــــ "یہ ہے میری بیٹی حطشی پسد کا بنوایا ہوا مندر ــــ جو میری طرف سے مصر کے درخشاں تخت پر جلوہ افروز ہے ــــ جو پوری دنیا کی رہنما ہے جسکے حکم کی بجا آوری ہر

انسان پر فرض ہے، جس کی اطاعت اور تعظیم کرنے والا زندہ رہے گا اور جس کی نافرمانی کرنے والا لقمۂ اجل ہو جائے گا ۔"

"لیکن تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو ۔" سلیم نے جذباتی انداز میں کہا ۔

"اس لئے کہ میں اسی مقدس مندر کے کھنڈر میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں ۔ اپنی وہ حسرت پوری کرنا چاہتی ہوں جو ہزاروں سال سے میرے سینے میں تڑپتی رہی اور جس کو دنیا کی کوئی مادّی قوت مجھ سے نہ چھین سکی ۔ اخمس ۔ میں دیوی عشتار[1] کی طرح تم سے کہتی ہوں ۔ اے میرے محبوب ۔ آ ۔ اور میرا شوہر بن کر مجھے اپنی دلہن بنائے میں تجھے مال دنیا میں سے کچھ نہیں دے سکتی لیکن میں تجھے اپنی لافانی محبت دے سکتی ہوں ۔ اپنے جسم کی خوشبو دے سکتی ہوں، اپنے رخساروں کا نکھار دے سکتی ہوں اور اپنی زندگی کا وہ آب حیات دے سکتی ہوں جس سے اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کی تخلیق ہوتی ہے ۔"

"لیکن زلیخا ۔ یہ شادی تو میرے والد کی موجودگی میں ہونا چاہیئے

---

[1] دیوی عشتار ۔ مصر، بابل، اور یونان کی سب سے مقدس دیوی تھی ۔، قدیم داستانوں کے بموجب بیحد عاشق مزاج تھی اور ایک مرتبہ بابل کے مشہور سورما جلج موس پر عاشق ہو گئی تھی ۔، اور از خود اس سے شادی کی درخواست کی ۔ جلج موس نے یہ شادی تو کر لی لیکن چونکہ دیوی عشتار کا مسکن آسمان تھا اس لئے یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی ۔

"نہیں احمس ـــ وہ شادی بعد میں بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ شادی مجھے اپنے دیوتاؤں کے سامنے کرنا ہے اور اس میں اس لئے تاخیر نہ ہونا چاہیئے کہ اسپاتا مجھے آج بھی اپنا منگیتر کہتا ہے" اسپاتا سے مت ڈرو زلیتھا، حسن اصغر اس کے جسم سے اس کی آنکھیں نکال کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھا کر چکا ہے ـــ" سلیم نے یقین بھرے انداز میں کہا۔

"پھر بھی احمس ـــ ہمیں دیوتاؤں کے حضور میں اپنی شادی کر لینا چاہیئے۔"

اور پھر چند منٹ کے بعد زلیتھا سلیم کو لے کر ایک دیوار کے سامنے کھڑی ہوئی اس نے اپنے سر کے چند بال توڑے اور انھیں سلیم کے قدموں میں ڈال دیا ـــ یہ گویا قدیم مصری رسم کے بموجب اس کا یہ اعلان تھا کہ اس وقت کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلیم کی ہو گئی ـــ اس رسم کے بعد زلیتھا نے دلہن کا پرانا گیت احمس کا ہاتھ اپنے ہاتھ لے کر گانا شروع کیا ـــ

"میری زندگی کے مالک ـــ اب میں تمہاری ہوں، میری پوری زندگی تمہاری ہے ـــ میرے جسم کا ہر حصہ تمہارا اور صرف تمہارا ہے ـــ آؤ ـــ آج سے ہم اپنے دیوتا کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، میرے محبوب آؤ ـــ ہم اس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں جس طرح مقدس نیل کے پانی کی لہریں

ایک دوسرے میں ضم ہو کر رقص کرتی رہتی
ہیں ۔ آج سے ہم مسرت کے گیت گانے
کے لئے بالکل آزاد ہیں ۔ آج کے بعد ہم اپنی
روح کو ہر لذت سے آسودہ کرنے کے لئے
مختار ہیں ، اب ہم مخمور ہواؤں کے درمیان
محبت کے نشے میں سرشار ہو کر گھوم سکتے ہیں آؤ
— میرے سرتاج — پھولوں کو ایک دوسرے
کے پیار کرنے میں جو لذت حاصل ہوتی ہے
ہم بھی اس کا تجربہ کریں ، ہم دونوں ایک دوسرے
کو اپنے دل کی دھڑکنیں سنائیں اور اتنے قریب
آجائیں کہ ہمیں موسم سرما میں بھی آگ کی ضرورت
نہ رہے ، اے میرے محبوب — اب مجھے رات کی
تنہائیوں کا ڈر نہ رہے گا اور چاہے تاریکی اور
نیند کا سمندر کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو مجھے صبح
کا کبھی انتظار نہ ہوگا — "

زلیخا نے جو عالم تصور میں خود کو دلہن سمجھ رہی تھی انتہائی
والہانہ انداز میں اپنی شادی کے اعلان کا یہ قدیم مصری گیت گایا اور
اس کے بعد کہا "احمس — جب تم شمالی جنگوں میں مصروف
تھے اور میدان جنگ سے بری بری خبریں آرہی تھیں تو میں دیوتا

آمن کے حضور میں جھک کر گھنٹوں دعا مانگا کرتی تھی کہ اسے میرے رب۔ احمس کو مجھ تک بخیریت پہنچا دے، میرے آنسو خشک ہوتے جا رہے ہیں، صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے، اسے میرے خالق ــ تو احمس کو جنگ کے بدترین نتائج سے بچا، اسے موت سے محفوظ رکھ اور اُسے اس دشمن سے بچا لے جو اس کے علاوہ تیرا بھی دشمن ہے ــ لیکن دیوتا آمن را نے میری یہ دعا نہ سنی اور مجھے مجبوراً تمہارے انتظار میں ایک طویل مدت کے لئے سو جانا پڑا ــ"

سلیم نے زلیتھا کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ انتہائی جذبات کے ساتھ اس نے زلیتھا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں صرف خوشی ہی خوشی شامل تھی اس نے کہا "بہر حال تمہاری دعائیں قبول ہوئیں اور میں جو تمہاری دعاؤں کا مرکز تھا آج تمہارے سامنے موجود ہوں ــ کیونکہ محبت ایک ایسی طاقت ہے جو موت کو شکست دیدیتی ہے ــ میں آج تک تمہیں اپنا ایک تصور یا کوئی حسین خواب ہی سمجھتا تھا لیکن آج تم بھی ایک زندہ حقیقت کی طرح میرے سامنے موجود ہو اور موت کی وادی سے اس طرح بچ کر نکل آئی ہو جس طرح تیز دھوپ میں پتیوں کی آغوش میں چھپا ہوا کوئی پھول ــ"

احمس اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا سکا، وفورِ جذبات سے اسکا دل بھر آیا آنکھوں میں چھلکنے والے آنسو زلیتھا کو اس کے دل کا پیغام

سنانے لگے ۔ اور پھر چند منٹ کے بعد دونوں دلوں نے اس یکجائی کو پالیا جو آج سے ہزاروں سال قبل زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے ان سے چھین لی تھی ۔

نہ معلوم کتنی دیر تک دونوں اسی طرح کھڑے رہے ، حد یہ کہ سورج ڈھلنے لگا اور روشنی کم ہونے لگی ۔ زلیخا نے احمس سے کہا "آؤ اب واپس چلیں ، دن ختم ہوا ، رات آرہی ہے ۔ میری سہاگ رات ۔"

"نہیں زلیخا ۔ دنیا کے موجودہ رسم و رواج کے تحت جب تک ہم دونوں کی شادی نہ ہو جائے ہماری سہاگ رات نہیں ہوگی ۔"

"اور یہ شادی کب ہوگی ۔" زلیخا نے بیچین ہو کر کہا ۔

"دہلی میں ۔ جہاں تم نے سب سے پہلے مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی ۔"

"گویا اس طویل انتظار کے بعد جو میں کر چکی ہوں مجھے ایک اور انتظار کرنا پڑے گا ۔" زلیخا نے گہری سانس لیکر کہا ۔

"ہاں ۔ لیکن یہ انتظار پندرہ دن سے زیادہ مدت کا نہ ہوگا ۔ ہم کل ہی یہاں سے قاہرہ روانہ ہو جائیں گے اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی ۔"

لیکن سلیم کے اس اطمینان دلانے کے باوجود زلیخا چپ سی ہو گئی ، اس نے ایک مرتبہ افق مغرب کی طرف دیکھا جہاں آفتاب دنیا پر الوداعی نظریں ڈال کر رات بھر کے لئے رخصت ہو رہا تھا ، پھر مشرق کی طرف

دیکھا جہاں پھیکے چاندنیں روشنی پیدا ہوتی جا رہی تھی، اور پھر دور وادی کی طرف دیکھا جہاں چٹانوں کے درمیان ایک چشمہ خاموشی اور سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

زلیخا کے چہرے کے ان تاثرات سے سلیم سمجھ گیا کہ وہ دہلی پہنچنے تک انتظار نہیں کرنا چاہتی چنانچہ اس نے اسے سمجھانے کے لئے کہا ۔۔ "اداس نہ ہو زلیخا ۔۔ مسکراؤ ۔۔ اس لئے کہ تمہاری مسکراہٹ ہم دونوں کے روشن مستقبل کی آئینہ دار ہے، تمہاری خوشی سے ہی ہمارے مستقبل کی خوشی وابستہ ہے ۔۔ غم نہ کرو ۔۔ مسکراؤ کیونکہ تمہاری اسی مسکراہٹ کی بنیاد پر مجھے زندگی کی لامتناہی مسرتوں کی عمارت بنانا ہے، مجھ پر بھروسہ کرو میری محبوبہ ۔۔ تمہارے اس مقدس مندر میں ہماری شادی ہو چکی اور ہم دونوں روحانی اعتبار سے ایک دوسرے کے ہو گئے لیکن موجودہ تہذیب اور رسم و رواج کے تحت ہم دونوں کے لئے ساری دنیا کے سامنے شادی کرنا بھی بیحد ضروری ہے ۔۔"

"تمہاری خاطر میں یہ انتظار بھی کر لوں گی ۔۔" زلیخا نے یہ جملہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن سلیم نے روشنی کم ہونے کے باوجود دیکھ لیا کہ شہزادی کی آنکھ میں آنسو امنڈ آئے ہیں، زلیخا کی آواز میں کتنا درد تھا اور لہجے میں کتنی محبت تھی سلیم کو اس کا پوری شدت کے ساتھ اندازہ ہوا اور مزید تسکین دینے کے لیے اس نے

زلیخا کو گلے سے لگا لیا ۔

"آؤ اب واپس چلیں ۔۔ ڈیڈی پریشان ہو رہے ہونگے ۔"

اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر خیموں کی طرف واپس آ گئے ۔

جہاں طہرانی عازم الدین سے کہہ رہا تھا ۔" خان بہادر صاحب ۔۔ وہ دونوں واپس آتے ہی ہونگے ، مجھے ان دونوں پر نہیں ان کے غیر فانی پیار پر بھروسہ ہے ، ان کی پاکیزہ محبت پر اعتماد ہے ۔ اور اس قوت پر یقین ہے جس نے اس طویل مدت کی جدائی کے بعد بھی دونوں کو ملا دیا ۔۔"

شہزادی کے قیام کے لئے طہرانی نے تمام خیموں کے درمیان ایک بڑا گول خیمہ نصب کرا دیا تھا اور اس کو مصر کی پرانی وضع سے آراستہ بھی کر دیا تھا ۔ تاکہ زلیخا کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو ۔ طہرانی خوب جانتا تھا کہ شہزادی کا شاہانہ مزاج اس کی طویل نیند کے باوجود باقی ہوگا اس لئے اس نے تمام ساتھیوں کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ زلیخا سے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ بات کریں ۔

ڈاکٹر بیگ نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ کیا زلیخا قدیم مصری زبان میں گفتگو کرے گی یا کسی اور زبان میں جو سیٹی اول کے دور میں رائج تھی ۔ سوال اپنی جگہ بالکل درست تھا لیکن نہ معلوم کیوں طہرانی کو یقین تھا کہ شہزادی اردو میں ہی بات کرے گی اس لئے کہ یہ اس کے محبوب کی مادری زبان ہے اور روح کے لئے کسی زبان کا جاننا یا سمجھنا ضروری نہیں ۔"

غرض ــ سورج غروب ہو چکا تھا اور مصر کا سحر کار سماں فطرت کی گود میں لوریاں سننے کی تیاری کر رہا تھا کہ زلیخا سلیم کے ساتھ خیموں کی قطار کے قریب پہنچ گئی ــ طہرانی نے بڑھ کر مودبانہ انداز میں کہا ــ "آپ کے قیام کا بندوبست وسطی خیمہ میں کیا گیا ہے شہزادی۔ ادھر تشریف لے چلیں ــ"

"مجھے خود امید تھی کہ میری واپسی تک آپ یہ انتظام کر چکے ہونگے۔" شہزادی نے پُر وقار لہجے میں کہا اور سب ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ ہو گئے۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ شہزادی اُردو میں بات کر سکے گی ــ

اس مرتبہ بھی فتح طہرانی کے خیال کی ہی ہوئی ــ

ڈر اور خوف کی ملی جُلی نظروں سے سب نے زلیخا کی طرف دیکھا۔ اور پھر سلیم کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ہر قسم کی الجھن یا خوف سے بالکل مبرّا تھا۔ دونوں وسطی خیمہ تک گئے اور پردہ اٹھا کر زلیخا خیمہ میں داخل ہو گئی ــ

واپس آکر سلیم نے عازم الدین سے کہا ــ "ڈیڈی ــ حبشی پشط کے قدیم مندر میں ہم دونوں قدیم رسم و رواج کے تحت ایک دوسرے سے شادی کر چکے ہیں ــ لیکن یہ شادی اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اسلامی طرز پر ہم دونوں کا نکاح نہ ہو جائے اس لئے کل ہی یہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کیجئے ــ ہم سب قاہرہ سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی واپس جائیں گے تاکہ اس کام میں مزید تاخیر نہ ہو ــ"

"اس لئے کہ زلیخا کی زندگی کا ایک باب ختم ہو کر ایک بالکل نیا باب شروع ہو رہا ہے۔" طہرانی نے گویا سلیم کی بات مکمل کر دی۔

"کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو سلیم۔ ہم یہاں سے کل دن میں کیسے روانہ ہو سکتے ہیں جبکہ ہمیں تمام سامان باندھنا ہے اور پیدل چلنے کا انتظام کرنا ہے کیونکہ زلیخا کے خوف سے تمام مزدور ہمارا ساتھ چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں اور اپنا کام کرنے کے لئے ہم بالکل تنہا ہیں۔" عازم الدین نے کہا اور منہ پھیر کر اس خیمہ کی طرف دیکھنے لگا جو خاص طور سے زلیخا کے لئے نصب کیا گیا تھا اور جس میں سے اس وقت ہلکی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی۔

"یہی نہیں۔ ہمارے پاس زلیخا کو مصر سے باہر لیجانے کا کوئی قانونی بندوبست بھی نہیں ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مصری حکام ہمیں ایک ایسی لڑکی کو اپنے ساتھ باہر لے جانے کی اجازت دیدیں گے جو ہماری آمد پر ہمارے ساتھ نہیں تھی۔" طہرانی نے کہا۔ "مشکل یہ بھی ہے کہ ہم فوری طور پر زلیخا کے لئے پاسپورٹ بھی نہیں بنوا سکتے، ہم اپنا مشن مصری حکومت سے بالکل چھپا چکے ہیں، ہم یہاں سیاح بطور آئے ہیں اور مان لیجئے ہم مصری حکومت سے یہ بتا بھی دیں کہ ہم نے ایک قدیم مقبرہ کھود کر زلیخا کی زندہ ممی نکالی اور پھر ایک پرانی دستاویز کی مدد سے اس کو بیدار کیا ہے تو ہماری بات کا کون یقین کرے گا۔" عازم الدین نے ایک ہی سانس میں جملہ مکمل کر دیا۔

"اور اگر یقین کر بھی لیا تو زلیخا ہماری نہیں مصر کے محکمۂ آثار قدیمہ

کی ملکیت سمجھی جائے گی ۔ اس کا پوری دنیا میں پروپگنڈہ ہوگا ۔ اور پھر حکومت مصر فرعون سیٹی اول کے دور کے اس زندہ مورخ کو کسی قیمت پر ہمارے حوالے نہیں کرے گی ۔" طہرانی نے ایک اور نکتہ نکالا۔

"کچھ بھی ہو ۔ ہمیں بہر حال یہ سوچنا ہے کہ ہم زلیخا کو سرزمین مصر سے کس طرح باہر لے جائیں کہ کسی کو نہ کوئی شبہ ہو اور نہ کانوں کان خبر ہو ۔" سلیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔

"اور میری آخری رائے ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بالکل ناممکن ہے۔" اب ڈاکٹر بیگ نے گفتگو میں مداخلت کی ۔

"مجھے بھی آپ کی رائے سے اتفاق ہے ۔" طہرانی نے کہا ۔ "ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم زلیخا کا پاسپورٹ ہی نہیں بنوا سکتے ۔"

"لیکن کیوں ۔؟" سلیم نے بیچین ہو کر پوچھا ۔

"اس لئے کہ پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے ہمیں یہ بتانا پڑے گا کہ زلیخا مصر کے کس قصبہ یا شہر کی رہنے والی ہے ، اس کی تاریخ پیدائش کیا ہے ، اس کے والد کا نام کیا ہے ، اس کی عمر کیا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ ہم زلیخا کے بارے میں یہ کوئی تفصیل نہیں بتا سکتے ۔ کیونکہ اگر ہم سچ بولتے ہیں کہ زلیخا آج سے ۳½ ہزار قبل مصر کے قدیم شہر تھیبز میں ایک شاہی خاندان میں پیدا ہوئی تھی اور آج تک زندہ ہے تو اوّلاً تو لوگ ہمیں پاگل سمجھیں گے اور دوئم یہ کہ ہمیں حکومت مصر کی اجازت کے بغیر قدیم عمارتوں کی کھدائی کرنے کے الزام میں گرفتار بھی کر لیں گے اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم خوب سوچ

سمجھ کر اپنے اگلے اقدام کے بارے میں فیصلہ کریں ۔" طہرانی نے پوری سنجیدگی سے کہا ۔

"میں مانتا ہوں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حقائق پر مبنی ہے لیکن کچھ ایسی مجبوری ہے کہ میں زلیخا کو اس وادی میں کل کے بعد نہیں رکھنا چاہتا ۔" سلیم کے انداز تخاطب میں التجا بھری ہوئی تھی ۔

"غالباً تمہارا اشارہ اسپاتا کی طرف ہے ۔" طہرانی نے اچانک کہا ۔

"ہاں ۔ لیکن آپ کو یہ نام کیسے معلوم ہوا ۔" سلیم کو اسپاتا کا نام طہرانی کی زبان سے سُن کر انتہائی حیرت ہوئی ۔

"حسن اصغر کی اس آخری تحریر سے جو اس نے مرنے سے قبل لکھی تھی ۔" طہرانی نے جواب دیا ۔

"خیر ۔ میرے خیال میں اب اس مسئلہ پر رات کے کھانے کے بعد تفصیلی بحث کی جائے گی ، ہم اس گفتگو میں یہ بھی بھول گئے کہ ہزاروں برس کے بعد آج شہزادی زلیخا زندگی کی بھرپور سانسیں لے رہی ہے اور ہمیں اس کے لئے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے ۔" ڈاکٹر بیگ نے یہ کہکر گفتگو ختم کر دی ۔ اور سلیم اپنے ذہن میں ایک نئی الجھن لئے ہوئے وہاں سے زلیخا کے خیمہ کی طرف چلا گیا ۔

تمام مزدور بھاگ چکے تھے ، ساتھ آیا ہوا عرب باورچی بھی ان مزدوروں کے ساتھ فرار ہو چکا تھا اس لئے کھانے کے انتظام میں بڑی دقت ہوئی ۔ شہزادی کے خیمہ میں کھانا پہنچا دیا گیا اور پارٹی کے تمام

افراد نے جب کھانے سے فراغت حاصل کر لی تو ایک مرتبہ پھر زلیخا کو لیجانے کے مسئلہ پر بحث چھڑ گئی ۔ گفتگو کے دوران میں اپنی رائے کو مزید تقویت دینے کے لئے سلیم نے اسپاتا کے بارے میں پوری کہانی بیان کر دی اور یہاں تک کہہ دیا کہ اسپاتا کی خبیث روح سے نہ صرف زلیخا کو بلکہ اُسے بھی خطرہ ہے کیونکہ اسپاتا بہر حال یہ نہیں چاہتا کہ زلیخا کی شادی میرے ساتھ ہو ۔

اور واقعی اسپاتا کی خبیث روح کے تصور سے ہر شخص کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے سرزمین مصر آکر وہ ایسے سنگین حالات سے دوچار ہونگے یہ کسی کے تصور میں نہ تھا ۔ سب سے زیادہ الجھن عازم الدین کو ہوئی ۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد یہ نیا خطرہ پیدا ہوگا ۔

"بہر حال ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے" ۔ طرانی نے سب کو ڈھارس دی ۔ "کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی سلیم کی رائے صحیح ہے ۔ ہمیں بہر حال یہ مقام کل شام تک چھوڑ دینا چاہیئے ۔ یہی نہیں شہزادی کی حفاظت کے لئے ہمیں تمام رات اس کے خیمہ کے چاروں طرف پہرہ بھی دینا چاہیئے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم انسانوں کا تو مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن روح کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔"

"میری تجویز ہے کہ ہم سب لکسر جا کر وہاں کے ہوٹل میں چند دن قیام کریں اور وہاں یہ سوچیں کہ زلیخا کو مصر کے باہر کس طرح لے جایا

جائے" ڈاکٹر بیگ نے کہا۔

"آقائے طہرانی ۔۔ تمام سامان یہیں چھوڑ دیا جائے، خیمہ اسی طرح نصب رہیں، ہم یہاں سے ناشتہ کے فوراً بعد لکسر کی جانب روانہ ہو جائیں گے" عازم الدین نے رائے دی۔

"نہیں ۔۔ ہمیں زلیخا کے مقبرہ سے توتس سوئم کا دفن کیا ہوا سونا بھی نکالنا ہے کیونکہ توتس سوئم کی تحریر کے بموجب ہم اس کے مالک ہیں ۔" طہرانی نے بھولی ہوئی بات یاد دلائی۔

"مگر طہرانی ۔۔ یہ سونا کہیں ہمارے لئے کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے" عازم الدین نے جو دولت کی طرف سے بالکل لاپرواہ تھا اپنے دل کی بات کہدی۔

"کوئی مصیبت نہیں ۔۔ ہم یہ سونا ضرور نکالیں گے ۔۔" طہرانی نے فیصلہ کیا۔ "سورج ڈھلنے سے قبل ہم مقبرہ سے یہ سونا نکال لیں گے اور فوراً لکسر کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔ لکسر پہنچکر ہم کسی مصری کو اس کے لئے رضامند کر لیں گے کہ وہ عارضی طور پر زلیخا کا باپ بن جائے تاکہ ہمیں زلیخا کا پاسپورٹ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور اگر کوئی مصری اس کام پر رضامند نہ ہوا تو بہر حال سونا ہمارے پاس موجود ہوگا ہم سونے کی رشوت دے کر کسی غیر ملکی جہاز راں کمپنی کو راضی کر لیں گے کہ وہ زلیخا کو غیر قانونی طور پر مصر سے باہر نکال کر اسے ہندوستان کے ساحل تک پہنچا دے ۔۔"

"بہت عمدہ تجویز ہے ۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے کسی کو اس تجویز کے کسی پہلو پر اعتراض نہ ہوگا ۔" سلیم نے خوش ہو کر کہا ۔

اور پھر یہ تجویز منظور ہو گئی ۔

لیکن اسے کاش انھیں معلوم ہوتا کہ حالات کتنی سنگین صورت اختیار کر چکے ہیں اور نہ صرف یہ رات زلیخا کے لئے کٹھن ہے بلکہ کل کی صبح بھی انکے لئے کتنی زبردست مصیبت لانے والی ہے ۔

فیصلہ یہ بھی ہوا تھا کہ تمام رات زلیخا کے خیمہ کے چاروں طرف پہرہ دیا جائے لیکن سلیم نے کہا کہ پہرہ دینے کے لئے صرف وہ کافی ہے ۔ سلیم کی یہ بات اس محبت اور شفقت کی بنیاد پر جو وہ سب سلیم سے رکھتے تھے رد ہو گئی ۔ طے یہ ہوا کہ دو دو گھنٹے ہر شخص پہرہ دے گا ۔ سب سے پہلے طہرانی کو پہرہ دینا تھا ، اور اس کے بعد سلیم کی باری تھی ۔

گفتگو کے خاتمہ پر سلیم زلیخا سے ملنے کے لئے اس کے خیمہ میں گیا تو وہ اپنے بستر پر اس طرح سو رہی تھی جیسے کوئی نرم و نازک پھول تیز ہوا کے جھکڑ سہنے کے بعد ٹھنڈی ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں کی لوریاں پا کر سو گیا ہو ۔ یا کسی ایسے مسافر کو جسے ایک عرصہ تک آرام کرنے کا موقع نہ ملا ہو اور وہ کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں تھک کر سو گیا ہو ۔ دیر تک سلیم وقت کی اس سب سے خوبصورت عورت کو دیکھتا رہا جس کے چہرے پر حنا کے پھولوں کا شبہہ ہوتا تھا ، وہ اپنے بستر پر اس انداز سے لیٹی ہوئی تھی جیسے موم کی ایک نازک مورتی ۔ جس میں باغ کے تمام پھولوں

کا حُسن اور چاند کی ہر ممکن رعنائی سمٹ کر یکجا ہو گئی تھی ۔

سلیم ۔۔۔ زلیخا کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ رات ۔۔۔ زلیخا کی آغوشِ محبت میں بسر کرنے کی رات تھی ۔ جو اس طرح ذہنی الجھنوں میں بسر ہو گی لیکن اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا ۔۔۔ کہ وہ صبر کرے ، انتظار کرے اور اخلاق اور معاشرہ کی حدوں کو پار کئے بغیر زلیخا کو ہمیشہ کے لئے اپنا نہ بنائے ۔۔۔"

اس نے چاہا کہ وہ زلیخا کو بیدار کر کے اس سے رات بھر کیلئے جدا رہنے کی اجازت حاصل کرے ۔ لیکن شہزادی کے ملکوتی حُسن کو دیکھکر اور ان رخساروں کو دیکھکر جس میں خیمہ کی کھڑکی سے دبے پاؤں آتی ہوئی چاندنی کی روپہلی کرنیں رقص کر رہی تھیں اس کی ہمت نہ پڑی ۔ اور اس نے سوچا ۔ "سلیم آج کی رات کے لئے یہی بہتر ہے کہ حسن سوتا رہے اور عشق اسکو دیکھتا رہے ۔"

شاہی انداز میں سجے سجائے اس خیمہ میں چاند اور چراغ کی ملی جلی روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔ ۔ اور اس روشنی میں محوِ خواب زلیخا کا چہرہ اس طرح روشن تھا کہ اس کی لمبی پلکیں ، ستواں ناک ، سنہرے بال اور دہکتے ہوئے رخسار چودھویں رات کے چاند کی طرح نمایاں تھے ۔ سنہرے بالوں کی ایک بل کھائی ہوئی لٹ اس کی سفید اور چمکتی ہوئی پیشانی پر اس طرح کھیل رہی تھی کہ سلیم کے لئے یہ منظر دیکھ کر تاب ضبط نہ رہی ۔

سلیم نے بڑھ کر بالوں کی یہ لٹ چہرہ سے ہٹائی اور زلیخا کی آنکھ کھل گئی ۔ وہ نیلی آنکھیں جن میں دوشیزگی کی معصومیت پاکیزہ فرشتوں کی طرح جھانک رہی تھی ۔ یہ آنکھیں سلیم کو دیکھ کر چند لمحات کے لئے مسکرائیں لیکن پھر اچانک جیسے یہ مسکراہٹ نیلی آنکھوں کے اس خاموش سمندر میں ڈوب کر مر گئی ۔ اور لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے حسرت و مایوسی کی گہری تاریکی چھا گئی ۔

"تم نے مجھے کیوں جگایا احمس ۔" ایک مدھم سا زنجیر میں بلند ہوا۔

"تم سے رات بھر کی جدائی کی اجازت مانگنے کے لئے ۔"

"مجھے سونے دیا ہوتا احمس ۔ گذرے ہوئے واقعات ماضی کے دھندلکے میں ابھر ابھر کر ایک رنگین اور مدہوش کن خواب کی صورت میں میری نیند کو لوریاں سنا رہے تھے ۔ ایک رات کے لئے جدائی کی اجازت مانگنے کا کیا سوال ۔ احمس ۔ تم تو گذشتہ ۳½ ہزار سال سے میرے ساتھ ہو ۔ آج اور گذری ہوئی کل میں فرق صرف اتنا تھا کہ کل تک تمہارے بغیر میری زندگی ایک خواب پریشان تھی لیکن آج ایک رنگین کیف ۔ لیکن اسے کاش تم مجھے نہ جگاتے ۔" زلیخا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا ۔

"مجھ سے غلطی ہوئی زلیخا ۔" سلیم نے جیسے معافی مانگی ۔

"نہ معلوم کیوں ۔ تمہیں دیکھ کر ایک نامعلوم سی آرزو میرے دل و دماغ کے کسی گوشے میں سلگنے لگتی ہے ، ایک انجانی سی تمنا میرے

جسم کی ہر رگ میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے اور احمس ـــ پھر میں بیقرار ہو جاتی ہوں ـــ میں سوچتی ہوں تنہائی کے راستے کتنے کٹھن ہوتے ہیں ـــ ربّ راء کی قسم ہزاروں سال تک میں صرف تمہاری یاد کے سہارے زندہ رہی ـــ غم کے ویرانوں میں بھٹکتی رہی، محبت کی تیز آگ میں جلتی رہی لیکن اتنی بیچین کبھی نہیں ہوئی جتنی کہ آج شام سے ہوں ـــ احمس ـــ سچ بتاؤ میری یہ بیچینی کسی حادثہ کا پیش خیمہ تو نہیں ـــ"

"نہیں زلیخا ـــ آنے والی صبح مسرت کے کھلتے ہوئے پھولوں کے ساتھ ہمارا استقبال کرے گی ـــ ہم کل ہی یہاں سے لکسر روانہ ہو جائینگے"

"ربّ راء تمہیں اس ارادے میں کامیاب کرے۔ لیکن سلیم اب تم بقیہ تمام رات کے لئے اس خیمہ سے باہر نہ جاؤ ـــ تم یہاں رہو گے تو مجھے رات پر بھی دن کا گمان ہو گا ـــ" زلیخا نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"میں ضرور رک جاتا زلیخا ـــ لیکن آقائے طہرانی خیمہ کے باہر موجود ہیں اور تم نہیں سمجھتیں کہ میرا قیام میرے بزرگوں میں میرا کتنا مذموم فعل سمجھا جائے گا ـــ"

"اچھا ـــ پھر جاؤ، دیوتا آمن تمہاری حفاظت کریں ـــ"

اور سلیم نے دیکھا کہ آنسوؤں کی دو ننھی سی بوندیں زلیخا کی آنکھوں کے دونوں گوشوں میں کانپ گئیں ـــ

سلیم نے چاہا کہ وہ بھی زلیخا سے کہے کہ تم دور ہوتے ہوئے بھی تمام رات میرے بالکل قریب رہو گی ـــ اتنی قریب جیسے جلتی ہوئی شمع کے

نزدیک پروانے ۔۔ یا کسی پہاڑی جھیل کے سینے سے چمٹے ہوئے کنول ۔۔ تم کیسے یہ اندازہ کر رہی ہو کہ یہ خوابناک سماں ۔ ستاروں کی ٹمٹماتی ہوئی جھلکیاں ہوا کے مست جھونکے اور تمہارے لبوں سے نکلتی ہوئی آواز کا یہ دھیما دھیما ترنم مجھے بیتاب نہیں کر رہا ہے ۔۔" لیکن خواہش اور ارادے کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا ۔

"خدا حافظ ۔۔" سلیم نے جذبات میں ڈوب کر زلیخا سے کہا اور خیمہ کا پردہ گرا کر باہر چلا گیا ۔

رات قبر کی طرح سنسان اور کسی مرمریں مجسمے کی طرح خاموش تھی ۔ باہر آ کر سلیم نے ایک مرتبہ پھر خیمہ پر نظر ڈالی اور پھر اپنے خیمہ کیطرف چلا گیا ۔۔

طہرانی پہرے پر موجود تھا ۔

لیکن اسے کاش معلوم ہوتا کہ سلیم کے باہر آتے ہی زلیخا کے خیمہ میں ایک اور سایہ داخل ہو چکا ہے ۔۔ اور شہزادی بالکل تنہا ہے ۔

باب ـــــــــــ ۲۰

یہ سایہ تاریک تھا ـــ اس لئے کہ یہ اسپاتا کی روح تھی ۔

" شادی مبارک ہو زیلیتھا ـــ "

" یہ آواز کہاں سے آئی ـــ کون مجھے مبارکباد دے رہا ہے ۔" زیلیتھا ڈر سی گئی ۔

" اسپاتا ـــ جو آج بھی تمہیں اپنی منگیتر سمجھتا ہے ـــ "

" لیکن تم مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتے ـــ " شہزادی اور زیادہ ڈر گئی ۔

" تمہارے دوست گیتاری نے زندگی کا آخری سفر اختیار کرنے سے قبل میرے جسم کی آنکھیں نکال لی ہیں زیلیتھا ۔ اس لئے میں جسم کے بغیر یہاں موجود ہوں ـــ "

"اور تمہارے آنے کا مقصد ــــ"

"میں تم سے کچھ بات کرنے آیا ہوں ــــ"

"لیکن میں بات کرنا نہیں چاہتی ــــ میں نہیں چاہتی کہ گذشتہ تاریخ کے اوراق جمع ہو کر ایک مرتبہ پھر میری زندگی کو سوگوار کر دیں ــــ اسپاتا ــــ ایک عورت کی آرزوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرو ــــ اور میری خوشیوں کو غم کے آنسوؤں میں تبدیل کرنے کی سعی نہ کرو ــــ"

"ڈرو مت زلیتھا ــــ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا ہوں ــــ حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں نقصان پہنچانے کی قدرت بھی نہیں رکھتا ــــ میں تم سے آخری اور صرف آخری بار ملنے آیا ہوں ــــ اور یہ بتانے آیا ہوں کہ تو تمس سوئم کے بنوائے ہوئے مقدس مندر میں احمس سے شادی رچانے والی زلیتھا یاد رکھے کہ شادی کے بعد بھی وہ احمس کی نہیں ہو سکتی ــــ"

"یہ تمہارا خیال ہے اسپاتا ــــ" اب زلیتھا بھی پُرسکون تھی ــــ

"خیال نہیں میری منگیتر ــــ ایک ایسی حقیقت ہے جسکو میں اسوقت بھی مستقبل کے پردوں پر لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں ــــ میں ایک دلہن کی مسکراہٹوں کے پیچھے آنسوؤں کا لہریں مارتا ہوا سمندر دیکھ رہا ہوں، میں ایک دولھا کے سہرے پر خزاں رسیدہ پھولوں کی لاش دیکھ رہا ہوں ــــ میں شادی کے ہنگاموں کو غمزدہ آہوں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا ہوں ــــ میں سچ کہتا ہوں کہ میں زندگی کے دل میں موت

کا کانٹا چبھتے دیکھ رہا ہوں ۔ زلیخا ۔ میں تمہاری بیوفائی اور سیٹی اول کی حکم عدولی پر تم سے کوئی انتقام لینے کے قابل نہیں رہا لیکن جس طرح میں گیتاری سے کہہ چکا ہوں اُسی طرح تم سے بھی کہتا ہوں کہ تم احمس کی نہیں ہو سکتیں ۔"

"تم خبیث ہو اسپاتا ۔ میں احمس کی اس وقت بھی تھی جب وہ شمالی جنگوں میں مصروف تھا ، اس وقت بھی تھی جب سیٹی اول نے تم سے میری منگنی کا اعلان کیا تھا ، اس وقت بھی تھی جب محض تمہارے ناپاک وجود سے خود کو دور رکھنے کے لئے میں نے زندہ ممی بننا منظور کیا تھا اور اس وقت بھی ہوں جبکہ تم اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ میرے اس خیمہ میں موجود ہو ۔ اسپاتا ۔ تم بھول رہے ہو کہ عورت مرد کے مقابلہ میں انتہائی مستقل مزاج ، باوفا اور محبت کو آخری سانس تک نبھانے والی ہوتی ہے ۔"

"میں سب جانتا ہوں ۔" اسپاتا کی آواز میں بے رحمی پیدا ہو گئی ۔

"پھر تم دور جاتے ہوئے غموں کو میری زندگی میں دوبارہ کیوں داخل کرنا چاہتے ہو ۔ تم میری تلخیوں اور مایوسیوں کی واپسی کیوں چاہتے ہو ۔ تم میری محبت کی لافانی فتح کو شکست میں تبدیل کرنا کیوں چاہتے ہو ۔ میں نے اپنی زندگی کے تاریک اور طویل راستے پر جو شمع جلا رکھی تھی اسکو تم کیوں بجھا دینا چاہتے ہو ۔ تم ایک خزاں کا جھونکا بن کر میری بہار کو

کیوں لوٹنا چاہتے ہو۔" زلیخا تقریباً چیخ پڑی۔

"میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ دیوتاؤں کا عذاب، تم پر از خود نازل ہوگا اور میں جانتا ہوں کہ یہ عذاب کیا ہوگا۔" اسپاتا کی آواز میں بدستور بے رحمی باقی تھی۔

"مجھے دھمکی نہ دو اسپاتا۔ اور نہ بد دعا دینے کے لئے مقدس دیوتاؤں کا سہارا لو۔"

"میری منگیتر۔ میں نہ تمہیں کوئی بد دعا دے رہا ہوں اور نہ دھمکی۔ میں تو صرف تمہاری تقدیر کی لکیریں پڑھ رہا ہوں کیونکہ میں روح ہوں اور روح سب کچھ جان سکتی ہے۔"

"تو مجھے بتاؤ کہ میری تقدیر میں کیا ہے۔"

"یہ بتا کر میں تمہاری کہانی یہیں اسی خیمہ میں ختم کر دانا نہیں چاہتا۔ اور میں اب رخصت بھی ہوتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خلش تمہیں بھی اسی طرح تڑپاتی رہے جس طرح میں تڑپتا رہا ہوں میں پھر کہتا ہوں کہ تم اجمس کی نہیں ہو سکتیں۔" خیمہ میں ایک بڑا ہی بھیانک قہقہہ بلند ہوا اور زلیخا نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ لئے۔

اسپاتا کی روح جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی اور خیمہ کے باہر پہرہ دینے والے آقائے طہرانی کو کچھ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ خیمہ کے اندر اتنی دیر تک کیا ہوتا رہا۔ اس لئے کہ خیمہ میں کوئی آواز نہیں گونجی، کوئی آہٹ نہیں پیدا ہوئی۔ اور پہرہ دینے کے باوجود طہرانی کو پتہ

نہرو لائبریری شاہدرہ

ہی نہ چلا کہ ایک خبیث روح ـــــ" گذرے ہوئے ماضی کا ایک خوفناک کردار اپنی گفتگو سے محبت کی ماری زلیخا کا سارا سکون درہم برہم کر کے جا بھی چکا ہے۔"

اسپاتا چلا گیا۔ لیکن زلیخا اسی طرح بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں کرب و اضطراب کا ایک وسیع سمندر لرز اٹھا۔ ماضی اور مستقبل سے لڑنے والی زلیخا درد سے بیتاب ہو گئی۔ اس کی پلکوں پر آنسوؤں کا نپنے لگے جیسے نرگس کی پنکھڑیوں پر شبنم کے موتی۔

خیمہ کے باہر چاند کی روپہلی کرنیں خاموش فضا میں رقص کر رہی تھیں، ہوا کے سرد جھونکے جھومتے ہوئے درختوں سے دبی دبی سرگوشیاں کر رہے تھے اور پوری کائنات نیند کی آغوش میں مدہوش ہو چکی تھی۔ لیکن خیمہ کے اندر شہزادی زلیخا اپنے دل پر ہاتھ رکھے ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اسپاتا کی پیشین گوئی کے بعد وہ اپنے تمام ارمانوں اور حسرتوں کے ساتھ فنا ہو رہی ہے۔ رات قبر کی طرح تاریک اور بھیانک ہو گئی ہے۔ اور باہر وادی میں ہوا کی سرسراہٹ ایسی آواز پیدا کر رہی ہے جیسے ایک ساتھ ہزاروں روحیں بین کر رہی ہوں۔

اس نے محسوس کیا جیسے وہ خیمہ میں نہیں کسی صحرا میں کھڑی ہے۔ اس کی قوت بینائی سلب ہوتی جا رہی ہے۔ وہ چیخنا چاہتی ہے لیکن چیخ نہیں سکتی، اجنبی کو پکارنا چاہتی ہے لیکن پکار نہیں سکتی۔ رونا چاہتی ہے لیکن رو نہیں سکتی۔

"دیوی عشتار ــــ میری مدد کر ــــ" زلیخا پوری قوت سے چیخی ــ اور آقائے طہرانی فوراً خیمہ میں آگیا ــ

شہزادی زلیخا بیہوش ہو چکی تھی ــ اس کا پورا جسم پسینہ میں شرابور تھا، سنہرے بالوں کی لٹیں اس کے سفید چہرے کے چاروں طرف ماتم کرنے کے انداز میں رقص کر رہی تھیں ــ شگفتہ چہرے پر بیکسی اور مایوسی لہریں مار رہی تھی ــ آقائے طہرانی یہ منظر دیکھتے ہی بدحواس ہو گیا ــ مدد کے لئے اس نے ڈاکٹر بیگ کو پکارا ــ اور چند منٹ کے اندر خیمہ میں تمام آدمی جمع ہو گئے ــ

اور جب ڈاکٹر بیگ کی انتہائی جدوجہد کے بعد زلیخا کو ہوش آیا تو وہ سلیم کی چھاتی سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "احمس ــ مجھے مستقبل میں یاس و ناامیدی کے ویران کھنڈروں کے سوا امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے ــ اسپاتا کی باتوں نے مجھے مایوسی اور بے بسی کی معراج پر پہنچا دیا ہے، میرے رنگین تصورات کا شیرازہ بکھرتا جا رہا ہے ــ مجھے بچا لو احمس ــ"

زلیخا روتی رہی اور سلیم اسے مسلسل تسلی دیتا رہا ــ عازم الدین طہرانی، ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر ــ سبھی تمام رات خیمہ میں موجود رہے ــ رات ڈھلتے زلیخا سو بھی گئی لیکن پھر بھی کوئی شخص خیمہ سے باہر نہیں نکلا ــ

اور جب صبح ہوئی تو ایک اور مصیبت ان کے سامنے کھڑی تھی، بھاگے ہوئے مزدوروں کی مخبری پر قریب کے گاؤں میں رہنے والے مصری کسانوں

کا ایک بہت بڑا گروہ ان کے خیموں کو چاروں طرف سے گھیر چکا تھا، اور ان کا یہ محاصرہ اتنا مسلح اور اتنا سخت تھا کہ مقابلہ کی کوئی صورت نہ تھی۔

زلیخا کو سوتا چھوڑ کر تمام آدمی خیمے سے باہر نکل آئے، اور طہرانی نے آگے بڑھ کر محاصرہ کرنے والوں سے مصری زبان میں محاصرہ کا سبب دریافت کیا۔

محاصرہ کرنے والوں میں سے ایک شخص جو صورت شکل و لباس کے اعتبار سے انکا سردار معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں قبیلۂ فزاز کا سردار ہوں اور ہمارا مذہب وہی ہے جو مصر کا قدیم مذہب تھا، ہم خود کو قدیم مصر کی تمام عمارتوں، مقبروں اور مندروں کا محافظ سمجھتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے وادیٔ ذراعنہ مصر کے ایک مقبرہ کو توڑ کر اس کی ممی چرالی ہے اور دفن شدہ خزانہ بھی نکال لیا ہے، ہم بجبر آپ سے یہ امانت واپس لینے آئے ہیں۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم آپ لوگوں پر ظلم کریں ہم آپ سے یہ درخواست کریں گے کہ آپ مصری شہزادی کی ممی اور خزانہ ہمارے حوالے کردیں۔ ورنہ نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہونگے۔"

حملہ آور سردار کا لہجہ اتنا روکھا اور غیر معمولی تھا کہ نہ صرف طہرانی بلکہ تمام لوگ ڈر گئے، ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ صورت حال اتنی جلد اتنی سنگین کروٹ لے سکتی ہے، لیکن بہر حال اس نئی افتاد کا بھی مقابلہ کرنا ہی تھا۔

طہرانی نے سردار کے مطالبہ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ معزز سردار

آپ کے مخبر کی یہ اطلاع صحیح ہے کہ ہم نے قدیم مصر کے ایک مقبرہ کو توڑا ہے۔ لیکن یہ اطلاع غلط ہے کہ ہم نے کوئی خزانہ کھودا ہے یا کوئی ممی نکالی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ آپ قدیم مصری عمارتوں کے محافظ ہیں اور آپ کا بھی وہی مذہب ہے جو فراعنہ مصر کا مذہب تھا تو میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ ہم پر کوئی جبر یا زیادتی کرنے کے بجائے ہم سے ہمارے کام میں تعاون کریں۔ کیونکہ ہم یہاں اپنے کسی ذاتی کام یا ذاتی منفعت کے لئے نہیں فرعون سیٹی اوّل کی ایک وصیت پر عمل کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

"میں آپ کی اس الجھی ہوئی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔" سردار کا رویہ اور لہجہ اب بھی سخت تھا لیکن طہرانی جو اپنی عمر میں ایسے کئی معرکے سر کر چکا تھا مطلق ہراساں نہیں ہوا بلکہ اس نے نہایت ٹھنڈے اور سوچے انداز میں اب تک کی ساری سرگذشت بیان کر دی۔ زلیخا کی نیند اور حیران کن بیداری کی ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "معزز سردار۔ شہزادی زلیخا صرف احمس یا سلیم کی نہیں آپ کی بھی ہے۔ اسپاتا کی خبیث روح اسے مسلسل پریشان کر رہی ہے۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کو اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ تحتمس سوئم کی وصیت کے بموجب زلیخا کے مقبرہ میں دفن شدہ سونا شہزادی کا جہیز ہے۔ چلئے۔ ہم سب مل کر یہ سونا کھودیں اور پھر آپ ہمارے ساتھ لکسر چلیں تاکہ ہم وہاں احمس اور زلیخا کی شادی کر کے یہ سونا ان کے حوالے کر دیں۔"

قدیم مصری فرقہ کا بوڑھا سردار انتہائی حیرت و استعجاب کے ساتھ

یہ کہانی سنتا رہا ــــ اور پھر اچانک چیخ کر بولا "دیوی عشتار کی قسم ــــ اگر ہم نے شہزادی زلیتھا کو زندہ نہ دیکھا تو میں تم سب کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گا ــــ"

چلو ــــ میں تمہارے ساتھ شہزادی کے حضور میں چلتا ہوں ــــ"

لیکن قبل اس کے کہ سردار اور اس کے ساتھی اپنے قدم آگے بڑھاتے، وسطی خیمہ کا زرکار پردہ اٹھا ــــ اور ایک مرمریں بت کی طرح سفید کپڑوں میں ملبوس نیلے گلاب کا پھول ہاتھ میں لئے ہوئے شہزادی زلیتھا باہر آ گئی۔

اور مع سردار کے تمام حملہ آور مصری سجدے میں گر گئے ــــ،

طہرانی، سلیم، عازم الدین اور پروفیسر کے علاوہ پارٹی کے تمام افراد نے پیچھے مڑ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی شہزادی کی طرف دیکھا، واقعی اس وقت وہ نیند سے بیدار ہونے والی زلیتھا نہیں ــــ قدیم مصر کے شاہی خاندان کی سب سے خوبصورت عورت شہزادی زلیتھا تھی، جس کے گلے میں خاندان فرعون کا امتیازی نشان سونے کا سانپ بل کھایا ہوا پڑا تھا ــــ

ڈر اور خوف کے اس ماحول میں شہزادی زلیتھا کے داخل ہوتے ہی ہیبتناک خاموشی چھا گئی ــــ لیکن سلیم ــــ اس کا دل مبہوت ہونے کے بجائے خوشی اور مسرت سے ناچ اٹھا ــــ اچانک ایک زندہ تمنا نے اس کے ذہن میں انگڑائی لی ــــ "اے کاش اسے اتنا حق حاصل ہوتا کہ وہ یہیں اسی وقت شہزادی زلیتھا کے سنہرے بالوں کی لمبی لٹوں کو اپنی انگلیوں میں پھنسا کر

اس کے سرخ یاقوتی لبوں کا ایک طویل بوسہ لے لیتا۔"

لیکن شہزادی زلیخا کے چہرے پر پھیلے ہوئے شاہانہ وقار اور معاشرہ کی قیود نے اس کی اس تمنا کے بڑھتے ہوئے حوصلے روک دئے ـــــ اور وہ صرف اپنی پیاسی آنکھوں سے شہزادی کی طرف دیکھ کر رہ گیا ـــ جو اب سجدہ میں پڑے ہوئے حصریوں کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی ـــ

اب سب کو زلیخا کے اگلے اقدام کا انتظار تھا ـــ

باب ـــــــــــ ۲۱

چند لمحات کے مکمل سکوت کے بعد فضا میں ایک مرتبہ پھر وہی آواز گونجی جو دو دن پیشتر عازم الدین نے وادیٔ فراعنہ مصر میں گونجتے سنی تھی۔

زلیتھا نے سجدہ ریز مصریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "قبیلۂ فراز کے بوڑھے سردار فگاتا ـــ میں تجھ سے بھی مخاطب ہوں اور تیرے قبیلہ کے دیگر افراد سے بھی۔ فگاتا ـــ صرف تجھے اس کی اجازت ہے کہ تو اپنا سر سجدہ سے اٹھا اور مجھے بیدار دیکھ کر فرعون زماں سیٹی اول کے طبی تجربہ کی کامیابی کے گیت گا۔ میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ دوبارہ یہاں آئے۔ میں چاہتی ہوں کہ میں لکسر تک تم سب آدمیوں کے ساتھ جاؤں اور تو۔ اپنے قبیلہ کے تمام افراد کے ساتھ میری شادی کے جشن میں شریک ہو۔ فگاتا ـــ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں احمس سے اپنی شادی لکسر کے

قدیم کھنڈرات میں کروں گی اور قرناق کے ہیکل اعظم کے اس گوشے میں دلہن بن کر اپنے دولھا کا انتظار کروں گی جہاں میں ہزاروں سال قبل اپنی نیند سے پہلے احمس کی واپسی کے انتظار میں بیٹھا کرتی تھی ۔

فگاتا ۔ میں جانتی ہوں تیرا سینہ قدیم مصری علم و فن کا مدفن ہے اور ہزارہا راز سینہ بسینہ منتقل ہو کر تجھ تک پہنچ چکے ہیں اس لئے تو اپنی پوشیدہ قوتوں کے ذریعہ اسپاتا کو تمام مترجباتوں کا خاتمہ کر دے ۔ تاکہ وہ آئندہ کبھی بھی مجھے پریشان نہ کر سکے ۔

فگاتا ۔ میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو اپنی نظریں اٹھا کر مجھے دیکھ لے تاکہ تجھے اندازہ ہو کہ ہزاروں سال قبل تیرے آباؤ اجداد کس خدوخال اور کس شان و شوکت کے مالک تھے ۔"

زلیتھا کا حکم پا کر فگاتا نے آہستہ آہستہ پہلے اپنا سر اٹھایا اور پھر لمحہ بھر کے لئے شہزادی کی طرف دیکھ کر دوبارہ اپنی نظریں جھکا لیں ۔ اس کے تمام ساتھی بدستور سجدہ ریز رہے ۔

اب زلیتھا احمس کی طرف مخاطب ہوئی ۔ احمس ۔ قبیلۂ فراز[1] کے ان افراد کے آجانے کے بعد میرے بےچین دل کو قرار آچکا ہے ۔ اب میرے نزدیک دشمن کی حیثیت ایک لومڑی سے زیادہ نہیں رہی جو صرف بھاگنا جانتی ہے مقابلہ

---

[1] قبیلۂ فراز کے لوگ غیر معمولی طور پر قدآور، خوبصورت، اور مضبوط ہوتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ انکی زندگی بیحد پراسرار ہے ۔

پر ٹھہرنا نہیں جانتی ۔ اس لئے احمس پہلے تمہارے فیصلہ کے بموجب میری شادی دہلی میں ہوتی لیکن اب لکسر کے نزدیک قرناق کے کھنڈروں میں ہوگی۔ یہ میرے مجبور دل کا فیصلہ بھی ہے اور میری ناکام تمناؤں کی التجا بھی۔"

ابھی سلیم دس شش و پنج میں ہی تھا کہ وہ زلیخا کو کیا جواب دے کہ عازم الدین جو ابتک یہ تمام منظر خاموشی سے دیکھ رہا تھا درمیان میں بول اٹھا۔ "شہزادی ۔ میں سلیم کی طرف سے تمہارا فیصلہ منظور کرتا ہوں۔ اور ہم سب آج ہی لکسر کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔"

عازم الدین کے اس جواب نے زلیخا کے مغموم اور غیر جذباتی چہرے پر چند لمحات کے لئے مسکراہٹ کی لکیریں پیدا کیں ۔ ایک مرتبہ گھوم کر اس نے قبیلۂ فراز کے سردار اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر شاہانہ انداز میں سب کو ہاتھ اٹھا کر رخصت ہونے کی اجازت دیدی۔ اجازت پاتے ہی قبیلہ کے تمام افراد اٹھکر ایک قریبی ٹیلے کی آڑ میں چلے گئے۔ طہرانی بھی ان کے ساتھ ہی گیا اور اس نے اسی ٹیلہ کی آڑ میں فگاتا سے لکسر کی جانب روانگی کا پروگرام بنا لیا۔ اس نے فگاتا سے یہ بھی طے کر لیا کہ شادی کے موقع پر وہ خود کو زلیخا کا سرپرست ظاہر کریگا اور پاسپورٹ کی درخواست پر بھی اس امر کی تصدیق کر دیگا کہ اس نے ہی بچپن سے زلیخا کو پالا ہے ۔ طہرانی نے مصر کے اس عجیب و غریب قبیلہ کے رہائشی گاؤں کا پتہ بیحد دریافت کیا لیکن فگاتا نے بالکل صاف انکار کرتے ہوئے یہ کہدیا کہ اسکا قبیلہ اپنا کوئی راز کسی غیر کو نہیں بتاتا۔

بہر حال اس طرح سے از خود زلیخا کی روانگی کا مسئلہ طے ہو گیا۔

طہرانی نے واپس آکر اپنے ساتھیوں کو بتا دیا کہ فگاتا ایک سرپرست کی حیثیت سے زلیخا کی روانگی کے کاغذات پر دستخط کرنے لئے تیار ہے۔ پاسپورٹ میں یہ بتایا جائیگا کہ ایک ہندی سیاح نے مصر کی سیاحت کے دوران میں ایک مصری دوشیزہ سے شادی کر لی اور اب وہ اپنی بیوی کو ہندوستان لیجانا چاہتا ہے۔ لکسر میں اسلامی طریقہ پر شادی کی رسومات ہونا بھی طے پا چکا تھا اس لئے اب قافلہ والوں کو کوئی الجھن نہ تھی اور بظاہر تمام کام انتہائی خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا۔

زلیخا دوبارہ اپنے خیمے میں جا چکی تھی۔

فگاتا کے ساتھیوں کی مدد سے رخت سفر باندھا جانے لگا، اور ادھر طہرانی نے یہ تجویز پیش کی اب مقبرہ سے توتس سوئم کا دفن کیا ہوا سونا بھی کھود کر نکال لیا جائے۔ چنانچہ زلیخا، عازم الدین طہرانی اور سلیم مقبرہ میں داخل ہوئے۔ مقبرہ کے اندرونی کمروں میں ایک عجیب مایوسی کا عالم طاری تھا اور بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کل تک یہ مقبرہ زندہ انسانوں کا مسکن تھا لیکن آج واقعی یہ مردوں کی ابدی قیام گاہ ہے۔ کل تک جس تابوت میں زلیخا زندگی کی نیند سو رہی تھی آج وہاں حسن اصغر کا مردہ جسم قیامت کا انتظار کر رہا تھا۔ تابوت والے کمرہ میں داخل ہوتے ہی سلیم کی آنکھوں میں اپنے دوست گیتاری کے لئے محبت کے آنسو آ گئے۔ اور زلیخا بھی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ توتس سوئم کی لکھی ہوئی جگہ پر کھدائی کی گئی اور واقعی پتھر ہٹاتے ہی ایک سنگی برتن میں سونے کے اتنے ٹکڑے برآمد ہوئے کہ ایک انسان ان کو لاد کر نہیں چل سکتا تھا، چنانچہ فگاتا کے دو آدمی بلائے گئے اور انکے ذریعہ سونا خیموں میں پہنچا دیا گیا

عازم الدین بے حد دولتمند تھا، طہرانی نے بھی اپنی عمر میں بے انتہا دولت دیکھی تھی لیکن یہ سونا دیکھ کر دونوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، ـــــ. ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ سلیم پلک جھپکتے میں اتنی بے پناہ دولت کا مالک ہو جائیگا۔

بہر حال اب صورت حال بالکل پُر سکون تھی اور سب کچھ بلا کسی زحمت کے ہو رہا تھا۔ طہرانی اور عازم الدین خیمہ گاہ کی طرف چلے گئے اور سلیم زلیتھیا کے ہمراہ وادی کی طرف گھومتے چلا گیا، ـــــ. فگاتا نے ان دونوں کو وادی کی طرف جاتے دیکھا اور پھر جیسے اچانک اسے ایک خیال آیا، چیتے کی طرح جست لگا کر وہ ایک ٹیلے پر چڑھا اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھنے لگا، ـــــ.

زلیتھا اور احمس ابھی مشکل سے سو قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک ان کے بالکل سامنے ایک سایہ اُبھرا، ـــــ. اور ایک چیخ بلند ہوئی جو سلیم نے نہیں صرف زلیتھا نے سنی، ـــــ "زلیتھا تم نے فگاتا کے ذریعہ مجھے فنا کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے۔ اس میں تمھیں کامیابی ہو گئی، ـــــ. لیکن جاتے جاتے میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تم احمس کی نہیں ہو سکتیں، ـــــ. میرا جسم جل رہا ہے، میں فنا کے بالکل قریب ہوں، فگاتا کے منہ سے نکلے ہوئے قدیم منتروں کا درد مجھے ختم کر رہا ہے لیکن میں بھی تمھارے بارے میں جو کچھ بتا چکا ہوں اُسکو دُنیا

کی کوئی قوت نہیں جھٹلا سکتی ——"

دھیرے دھیرے یہ آواز ڈوبنے لگی، —— سایہ روشنی میں تحلیل ہونے لگا، —— اور زلیخا کے دیکھتے ہی دیکھتے جو تاریک دھبہ ابھی اس کے سامنے ابھرا تھا وہ فضا کی روشنی میں منتشر ہو گیا —— اسپاتا کا وجود ختم ہو گیا —— زلیخا کی زندگی کا سب سے بڑا خطرہ دور ہو گیا اور سلیم کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ ایک کہانی ختم ہو گئی ——

اسپاتا کا خطرہ ختم ہو چکا تھا لیکن اس کی دھمکی بدستور باقی تھی —— زلیخا اس تاریک دھبے کو فضا کی روشنی میں تحلیل ہوتے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ آخر اسپاتا کی اس دھمکی کا کیا مطلب ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ احمس سے مل جانے کے باوجود وہ احمس کی نہ ہو سکے —— زلیخا کا دماغ تھک گیا —— ساری دنیا اسے ایک بوجھ معلوم ہونے لگی —— اردگرد کا ماحول فکر میں ڈوبا ہوا دکھائی دینے لگا —— آنکھیں غم کے تصور سے بند ہونے لگیں —— اور اس نے سکون کے لیے اپنا سر سلیم کی چھاتی سے لگا لیا ——

ادھر وادی فراعنہ مصر میں سلیم اور زلیخا دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے سے اپنے مستقبل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور ادھر خیمہ گاہ میں طہرانی ڈاکٹر بیگ سے کہہ رہا تھا "یہ لڑکی جس کی آواز میں موسیقی کا لوچ بھرا ہوا ہے اور جو ہزاروں سال تک وادی خموشاں میں سوتی رہی ہے اس پوری دنیا کے لیے بڑی کارآمد ہو سکتی ہے اگر ہمیں وہ اپنی یادداشت کے بل پر اس علم کی تفصیل بتا دے جو فنا ہو چکا ہے اور

جس کی مدد سے علم آثار قدیمہ، طبابت، عمل جراحی اور جسمانی ساخت سے متعلق تمام علم و فن میں زبردست انقلاب لایا جا سکتا ہے۔"

"آقائے طہرانی آپ کچھ بھی کہیں ـــ لیکن میرا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ جسم اور روح کے درمیان جو رشتہ ہے اس کی تفصیل ہم کسی قیمت پر نہیں حاصل کر سکتے" عازم الدین نے کہا۔

"عقیدہ اور سائنس دو الگ الگ چیزیں ہیں اور اسکی بحث لمبی ہو سکتی ہے، میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر طہرانی کی کوششوں سے زلیخا نے ماضی کے اس زبردست تجربہ کے بارے میں کچھ بھی بتا دیا تو یہ ہمارے اس سفر کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا" ڈاکٹر بیگ نے گفتگو میں مداخلت کی۔

ابھی شاید یہ گفتگو اور ہوتی کہ زنگا تانے آکر پہلے ایک لمبا سلام کیا اور اس کے بعد یہ اطلاع دی کہ تمام سامان اس کے آدمی باندھ چکے ہیں اور اب سب کو صرف روانگی کے حکم کا انتظار ہے، زنگا تانے تمام مہمانوں کے لیے سواری کے گھوڑوں کا بھی انتظام کر دیا تھا ـــ لیکن روانگی کیسے ہوتی جبکہ ابھی تک سلیم اور زلیخا وادی سے واپس نہیں آئے تھے۔

اجڑی ہوئی اس خیمہ گاہ میں جہاں صبح تک ہندوستان سے آئے ہوئے چند سیاحوں نے ایک بستی سی بسا رکھی تھی زلیخا کی واپسی کا انتظار ہو رہا تھا اور دور وادی کے ایک کھنڈر میں زلیخا اپنے محبوب سے کہہ رہی تھی "ایک طویل کہانی کا خاتمہ قریب ہے احمس ـــ آج شام کو قرناتا کے ویرانے میں میری اور تمھاری دوسری شادی ہوگی اور اس کے بعد ایک نئی کہانی

شروع ہو جائے گی"۔

"ہاں زلیخا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جوانی کے محبت بھرے خوابوں سے زیادہ زندگی میں کوئی چیز حسین نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ میرے خیال میں اس پوری کائنات میں تم سے زیادہ خوبصورت کوئی شے ممکن نہیں ہے ۔۔۔ اور میری کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس چیز کا مالک میں ہونے جا رہا ہوں"

"اور مجھے جھلمل جھلمل کرتے ستاروں کی چمک میں، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں، بارش کے گیت میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو محض تمہاری قربت میں حاصل ہوتا ہے۔" زلیخا نے جذباتی آواز میں کہا اور اس کے بالوں میں اپنی لمبی مخروطی انگلیاں پھنسا لیں۔ اور سلیم زلیخا کے ان باریک لبوں کی طرف دیکھتا رہ گیا جو گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ نرم اور سرخ تھے، رعب حسن سے سلیم کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔۔۔

زلیخا اپنی جھیل ایسی نیلی آنکھوں سے مسلسل اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور سلیم سوچتا رہا۔ "ہاں یہ وہی عورت ہے جسے ارضی و سماوی قوتوں نے ہزاروں برس تک اپنی دعاؤں اور برکتوں کے سائے میں رکھا۔ وہی عورت جس نے سو دروازوں والی راجدھانی تھیبز میں تخت شاہی پر بیٹھ کر عظیم الشان سلطنت کا انتظام کرنے والے سیٹی اول کے حکم پر بظاہر خود کو قربان کر دیا تھا۔۔۔ وہی عورت جو اس سے ملنے کے لیے موت تک کے دروازے پر دستک دیکر لوٹ آئی تھی۔۔۔"

دیر تک دونوں اسی طرح خاموش کھڑے رہے اور پھر مزید کوئی گفتگو کئے بغیر خیمہ گاہ کی طرف لوٹ آئے جہاں ہر شخص انکا منتظر تھا ــــ روانگی کے لیے قافلہ بالکل تیار تھا ــــ زلیخا کو دیکھتے ہی قبیلۂ فراز کے تمام لوگ سجدہ میں گرے لیکن زلیخا نے ان کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد ایک سفید گھوڑے پر بیٹھ کر لکسر کی جانب روانہ ہو گئی ــــ.

پورا قافلہ اس کے پیچھے تھا ــــ اور یہ قافلہ اس طرح لکسر کی جانب بڑھ رہا تھا جیسے واقعی کسی ملکہ کا جلوس جا رہا ہو ــــ دور درختوں اور اونچے نیچے ٹیلوں کے جھرمٹ میں خاموشی اور سکون کے ساتھ نیل بہہ رہا تھا ــــ زلیخا کبھی بہتے ہوئے نیل کی طرف دیکھتی اور کبھی مضافات میں پھیلے ہوئے ویرانوں کی طرف ــــ.

یہ ویرانے کبھی آباد تھے، ــــ کبھی ان ویرانوں میں زندگی اپنی معراج پر تھی، ہر جانب شان و شوکت کے مظاہرے تھے، پر شکوہ عمارتیں تھیں، پر ہیبت مندر تھے، ــــ بارعب کاہن تھے، ــــ خوبصورت عورتوں کے زندہ مجسمے تھے، ــــ کاروبار سے بھرپور بازار تھے ــــ لیکن آج ــــ زلیخا اس ویرانے کی گذری ہوئی کل بھی دیکھ چکی تھی اور آج کی ویرانی بھی ــــ نہ معلوم کیوں اسکی گھنی پلکوں میں آنسو تھرتھرا اٹھے ــــ.

دور بہت دور سے کسی دیہاتی مسجد کے بلند مینار سے ظہر کی نماز کے لیے مؤذن کی آواز بلند ہوئی ــــ مؤذن لوگوں کو سچائی اور نیکی کی طرف بلا رہا تھا ــــ "اللہ اکبر ــــ لا الہ الا اللہ"، اور مؤذن کی یہ آواز پوری فضاء کے

سناٹے میں پھیل کر یہ اعلان کر رہی تھی کہ خدا سب سے بڑا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ۔" قافلہ کے افراد اپنی زندگی میں ہزاروں مرتبہ اذان سن چکے تھے لیکن آج انھیں ان معجزانہ الفاظ کا صحیح مطلب معلوم ہوا آج اس آواز نے ان کو ایک خاص قسم کا روحانی کیف دیا ۔ آج انھیں محسوس ہوا کہ سنسان اور تنہا راستوں میں کون سب سے بڑا رہبر ہوتا ہے ۔ اور آج انھیں احساس ہوا کہ زندگی کی پے در پے مشکلات پر صرف اسی آواز پر لبیک کہہ کر قابو پایا جا سکتا ہے ۔ مغربی تعلیم کا پرستار سلیم اس آواز کو سن کر سوچنے لگا کہ صبر و استقلال کی زندگی کے لیے اسلام کا فلسفہ کتنا حکیمانہ اور کتنا حتمی ہے ۔ اور پھر بالکل غیر ارادی طور پر اس نے گھوڑا روک دیا ۔ قافلہ کے تمام ہندوستانی مسافروں نے اسکی تقلید کی ۔ اور ابھی مؤذن کی اذان ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سلیم اور اسکے ساتھیوں نے نماز کی صف باندھ لی اور اپنے ان دیکھے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے ۔

نماز ہوتی رہی اور زلیخا رکوع و سجود کا یہ روحانی منظر دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ احمس اور اس کے ساتھی کس خدا کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں جبکہ کوئی خدا ان کی نگاہوں کے سامنے موجود نہیں ہے ۔ چنانچہ جب نماز سے فراغت پانے کے بعد قافلہ دوبارہ لکسر کی جانب روانہ ہوا تو اس نے سلیم سے پوچھا کہ وہ سب کس خدا کے سامنے سجدہ کر رہے تھے ۔

"اس خدا کے سامنے جو لاشریک ہے جس کے رسول محمدؐ عربی ہیں اور جس کے حکم سے ہم ہزاروں سال تک علم طب کے سہارے سوتی رہیں ۔"

سلیم نے جواب دیا اور زلیخا خاموش سی ہو گئی ۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ جو انسانی جسم کو خدا سمجھ کر اسکی پرستش کرتی رہی ہو ۔ اتنی جلدی اپنے خدا اور اس خدا کے ہزاروں بیٹوں کے وجود کو رد کر دیتی ۔۔۔

اب لکسر کی آبادی بھی دور سے دکھائی دے رہی تھی ،

"احمس ۔۔۔ ہم لکسر نہیں ۔۔۔ قرناق جائیں گے ، اس لیے کہ قبیلۂ فراز کے لوگ آج تک کسی ایسی آبادی میں داخل نہیں ہوئے جس میں ان کے مذہب کے ماننے والے نہ رہتے ہوں ۔۔۔" زلیخا نے کہا اور گھوڑے کی باگ کھینچ لی ۔۔۔

"لیکن قرناق کے ویرانے میں شادی کا انتظام کیسے ہو سکتا ہے ۔۔۔" سلیم نے پریشان ہو کر کہا ۔

"کچھ بھی ہو ۔۔۔ تمھارے مذہب کی تمام رسومات وہیں ادا ہوں گی اور میں قرناق میں ہی دلہن بنوں گی ۔۔۔ یہ میرے قبیلہ کی رائے ہے اور مجھے بہرحال ان کے جذبات کا احترام کرنا ہے ۔۔۔"

اس گفتگو کے دوران میں پورا قافلہ ٹھہر چکا تھا اور تمام افراد کو صرف اسکا انتظار تھا کہ ان کو کس طرف روانگی کا حکم دیا جاتا ہے ۔۔۔ لکسر کی جانب یا قرناق کے ویران کھنڈروں کی جانب ۔۔۔

"ہمیں قرناق کی طرف جانا ہے ۔۔۔" قافلہ والوں نے سلیم کی آواز سنی اور سب کے سب قرناق کی قدیم شاہراہ پر گامزن ہو گئے ۔۔۔ راستہ میں طرانی نے عازم الدین سے شادی کی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں تفصیلی طور پر بات کی ۔۔۔ پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ لکسر سے مولوی بلا کر نکاح پڑھوا لیا جائے لیکن چونکہ اسمیں

افشائے راز کا ڈر تھا اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ نکاح کا صیغہ خود طہرانی پڑھ دے گا اور اس طرح زلیخا اسلامی طریقہ پر سلیم کی ہو جائے گی۔

طہرانی کے خیال میں زلیخا کی ہزاروں سال پرانی کہانی کا خاتمہ یونہی ہونا تھا لیکن اے کاش اسے معلوم ہوتا کہ اس کہانی کا انجام کیا ہوگا۔ اور پیچھے حالات اچانک کتنی حیرت ناک کروٹ لے لیں گے۔

تقریباً ۵ بجے شام کو قافلہ قرناق کے ہیکل کے قریب پہونچ گیا اور قبیلۂ فراز کے آدمیوں نے انتہائی مستعدی اور پھرتی کے ساتھ خیمے نصب کرنا شروع کر دیے۔ ان کے سردار کا حکم تھا کہ شام سے پہلے کام ختم ہو جائے تاکہ شہزادی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قبیلہ کے افراد نے غیر معمولی محنت کے بعد اس ویرانے کو ایک اچھی خاصی آبادی میں تبدیل کر دیا۔ شام قریب تھی اور ڈوبتا ہوا سورج جو ہزاروں سال سے قرناق کے تباہی اور ویرانی کا خاموش تماشائی بنا ہوا تھا آج ایک عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا۔

آج قرناق کے کھنڈروں میں یہ تہذیبوں کا ملاپ ہو رہا تھا۔ ایک طرف قبیلۂ فراز کے افراد اپنے قدیم مصری خدوخال، لباس اور اپنے دل میں مذہبی احترام کا جذبہ لئے ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے تو دوسری طرف جدید تہذیب اور نئی دنیا کے چند انسان شادی کے انتظامات میں الجھے ہوئے تھے۔ اگر ایک طرف زلیخا اپنے شاہی طرز کے خیمے میں خود اپنے ہاتھوں خود کو قدیم مصری انداز میں دلہن بنا رہی تھی تو دوسری طرف

م الدین اپنے اکلوتے بیٹے کو دولھا بنا رہا تھا۔۔۔

آج قرناق کے کھنڈروں میں ماضی کے گم شدہ اوراق زندہ حقیقت
کر سامنے آ رہے تھے۔۔۔ اور ایک ایسا واقعہ ہونے جا رہا تھا جس کا کوئی
ص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ قرناق کے یہ کھنڈر ہزاروں سال کی
وں، آرزوؤں، اور حسرتوں کے سنگم بنتے جا رہے تھے۔۔۔ اور یہاں کا منظر
کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس ویرانے میں کچھ روحوں نے اپنا
ضی مسکن بنا لیا ہو۔ ہر شخص خاموش تھا، سنجیدہ تھا، اور ہر دل اس طرح
ڑک رہا تھا جیسے وہ کسی شادی میں نہیں کسی عدالتی کارروائی میں شریک
ہے۔۔۔

اب شام ہو چکی تھی۔۔۔ سلیم دولھا بن چکا تھا لیکن زلیخا کے دلہن بن جانے کی
اطلاع اب تک نہیں آئی تھی۔۔۔ چنانچہ طہرانی نے سوچا کہ وہ خود جا کر
کو اس خیمہ تک پہونچا دے جہاں نکاح ہونا تھا۔۔۔ اس فیصلہ کے بعد وہ
دی کے خیمہ تک گیا۔۔۔ اندر آنے کی اجازت مانگی اور جب اجازت پا کر
ر گیا تو اس نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اس نے اسے بھی چند
ں تک کے لیے بالکل مدہوش کر دیا۔۔۔

کیونکہ اس کے سامنے ایک خوبصورت مسہری پر جو عورت لیٹی ہوئی تھی
ت نہیں قوسِ قزح تھی، رنگوں کا ناقابلِ تشریح امتزاج۔۔۔ لہروں کی
ایک آتا اور ایک جاتا ہوا رنگ۔۔۔ لمحہ بھر کے لیے طہرانی کو ایسا محسوس
یسے آج عمر میں پہلی بار وہ کسی شاعر کے شعر کو ایک ناقابلِ قصور نسائی پیکر

میں دیکھ رہا ہے۔ وہ کسی مغنی کے راگ کو زندگی کی کروٹیں لیتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ وہ کسی مصوّر کے خیال کو جوانی کی بھرپور سانسیں لیتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ جیسے آج اس خیمہ میں وہ پھول کی خوشبو، ستاروں کا نور اور چاند کی کرنوں کا مسرت بھرا رقص دیکھ رہا ہے۔

چند لمحات کی غیر ارادی مدہوشی کے بعد طہرانی نے ہلکی آواز میں پوچھا "کیا شہزادی بحیثیت دلہن پوری طرح تیار ہیں؟"

"ہاں ۔۔۔ میں بالکل تیار ہوں لیکن سلیم کے پاس جانے سے قبل میں قبیلۂ فراز کے سردار فنگاتا سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں ۔۔۔ اس لیے آپ اسے میرے پاس بھیج دیجئے اور اس کا خیال رکھئے کہ کوئی شخص ہم دونوں کی گفتگو نہ سن سکے۔"

"میں فنگاتا کو ابھی آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔" طہرانی نے جواب دیا ۔۔۔ اور اسکا پورا خیال رکھونگا کہ کوئی شخص آپ دونوں کی گفتگو کے دوران میں اس خیمہ کے قریب تک نہ آنے پائے۔"

"آپ سلیم کے خیمہ میں میرا انتظار کیجئے ۔۔۔ میں فنگاتا کے ساتھ ہی وہاں پہونچ جاؤنگی۔" شہزادی نے اپنی بات ختم کرتے ہی کچھ ان نظروں سے طہرانی کی طرف دیکھا کہ وہ فوراً خیمہ کے باہر چلا گیا اور فنگاتا کو اطلاع دے دی کہ اسے شہزادی زلیخا نے اپنے حضور میں طلب کیا ہے۔

اور اب خیمہ میں فنگاتا اور زلیخا میں گفتگو ہو رہی تھی۔

زلیخا نے افسردہ لہجے میں کہا ۔۔۔ "فنگاتا تم خوب جانتے ہو کہ میں کون

ہوں؟ میرا خاندان کیا ہے؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور میں اب تک کیوں زندہ رہی"

"میں خوب جانتا ہوں شہزادی ـــ ربّ دا کی قسم میں تو آپ کو دیوی عشتار کی بیٹی سمجھ رہا ہوں کیونکہ میں نے عالم تصوّر میں دیوی عشتار کی جو تصویر دیکھی ہے اسمیں اور آپ میں بظاہر کوئی فرق نہیں ـــ" نگاتا نے نظریں جھکا کر کہا ـــ

"لیکن میں بہت پریشان ہوں نگاتا ـــ رہ رہ کر مجھے اسپاتا کی دھمکی یاد آ جاتی ہے اور میں یہ سوچنے لگتی ہوں کہ اسپاتا نے فنا ہوتے ہوئے آخر یہ کیوں کہا تھا کہ میں احمس کی ہو جانے کے باوجود احمس کی نہیں ہو سکتی ـــ" شہزادی کے لہجے میں بلا کی غمگینی مستور تھی ـــ

"عالی مقام شہزادی ـــ آپ اسپاتا کی حاسدانہ دھمکی کا وہم دل میں نہ لائیے اور مطمئن رہیئے کہ دیوتاؤں کا سایہ آپ پر باقی ہے اور دنیا کی کوئی قوت احمس کو آپ سے نہیں چھین سکتی ـــ"

"پھر بھی ـــ نہ معلوم کیوں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، جبکہ آج میری شادی ہے، آج کی رات میری سہاگ رات ہے اور مجھے بے پناہ حد تک خوش ہونا چاہیئے ـــ"

"یقین جانیئے شہزادی ـــ جب تک نگاتا زندہ ہے آپ کو اسپاتا کی دھمکی کے زیر اثر کوئی صدمہ نہیں پہونچے گا ـــ جہاں تک میرا علم بتاتا ہے اسپاتا بالکل فنا ہو چکا اور اب اس کے وجود کا ہلکا سا شائبہ بھی باقی نہیں ہے،

— اس لیے اے فراعنۂ مصر کی آخری زندہ شہزادی آپ غم اور وہم سے بالکل بے نیاز ہو کر خیمے سے باہر نکلیے — احمس کے خیمہ میں تمام لوگ آپ کے منتظر ہیں اور میرے آدمی آپ کی شادی کا استقبالیہ جشن کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں —" فنگا تا نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا تم شادی کا قدیم رقص کرو گے —" زلیخا نے معصومانہ انداز میں پوچھا —

"ہاں شہزادی — صدیاں گذر گئیں کہ ہم نے یہ رقص نہیں کیا — لیکن آج دیوتاؤں کی مہربانی سے یہ موقع مل گیا —" فنگا تا نے جواب دیا۔

"پھر چلو — میں تیار ہوں —" زلیخا نے کہا اور باہر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

اور پھر سلیم کے خیمہ میں بیٹھے ہوئے سیاحوں نے دیکھا کہ گو آفتاب ڈوب چکا ہے لیکن پھر بھی ایک آفتاب ان کے خیمے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

آخری باب

اور اب زلیخا سلیم کے خیمہ میں تھی۔

خیمہ کے باہر قبیلہ فراز کے لوگ جلتی ہوئی مشعلیں ہاتھ میں لیے کھڑے تھے ـــــ اور صرف اس کے منتظر تھے کہ نکاح کا اعلان ہوتے ہی وہ استقبالیہ رقص شروع کر دیں۔ ـــ دور وہ بڑا پتھر بھی نظر آ رہا تھا جس پر کھڑے ہو کر مصری روایات کے بموجب ان دونوں کو اپنی ازدواجی زندگی کا اعلان کرنا تھا ـــــ ہر طرف تاریکی تھی کبھی کبھی بادلوں کی اوٹ سے چاند اپنی جھلک دکھاتا لمحہ بھر کے لیے فضا میں روشنی پھیلتی اور اس کے پھر تاریکی چھا جاتی۔ـــ

خیمہ کے وسط میں سلیم دولھا بنا بیٹھا تھا۔ ایک طرف عازم الدین اور دوسری جانب ڈاکٹر بیگ بیٹھے تھے ـــــ اور طرانی زلیخا کے سامنے بیٹھا تھا۔ سکاتا خیمہ کے دروازے پر ادب سے کھڑا تھا، خیمہ کے پورے ماحول پر ایک

عجیب سا اسرار چھایا ہوا تھا، اور ہر شخص کے چہرے پر مسرت کے بجائے ایک انجانا خوف پھیلا ہوا تھا۔ سہرے کے پھولوں کی آڑ سے سلیم نے نیچی نظروں سے زلیخا کے پھول سے چہرے کو دیکھا جو ایک باریک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور یہ دیکھ کر اس کو انتہائی حیرت ہوئی کہ اس کے آفتابی رخساروں پر آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک رہی ہیں۔ سلیم کو پورا یقین تھا کہ زلیخا ایک عزم صمیم رکھنے والی خاتون ہے جس کے پائے استقامت کو کبھی لغزش نہیں ہوتی، چنانچہ اس نے سوچا کہ آخر وہ کون سا خوف یا شک ہے جس کی بنیاد پر زلیخا اس وقت غم و افسوس کے آنسو بہا رہی ہے۔ اور پھر سلیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے ماضی کا ایک نامعلوم سا پردہ جو شعور انسانی سے بالاتر ہے اس کے خیالات پر چھاتا جا رہا ہے ابھی شاید وہ کچھ اور سوچتا کہ طہرانی نے اسلامی رسم کے بموجب پہلے زلیخا سے اور پھر سلیم سے اس شادی پر انکی توثیق مانگی اور جب دونوں نے "ہوں" کہدی تو نکاح کا صیغہ پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ سارا کام بھی چند منٹ میں ہو گیا، تمام افراد نے عازم الدین کو مبارکباد دی اور اس طرح زلیخا اسلامی قانون کے تحت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلیم کی ہو گئی۔ فگاتا نے فوراً باہر جا کر اپنے قبیلہ کے آدمیوں کو شادی کی اطلاع دی اور باہر طبل کی زوردار آواز کے ساتھ ایک ایسا رقص شروع ہو گیا۔ جو ہزاروں سال سے اس سرزمین نے نہیں دیکھا تھا۔

ایک عجیب و غریب رقص جس میں قدم قدم پر ہر ناچنے والے کے لیے موت کا خطرہ تھا۔ طبل کی آواز کے ساتھ قبیلۂ فراز کے آدمی پیر پٹکتے۔ اور

اچھل اچھل کر اپنی تلوار سے سامنے والے شخص پر حملہ کرتے ۔۔۔ چند آدمی بے ہنگم آواز سے کوئی مذہبی گیت بھی گا رہے تھے ۔۔۔ گویا اس طرح قرناق کے کھنڈر ایک مرتبہ پھر اپنے معماروں کے دورِ حکومت میں ماضی کی تمام دیواروں کو مسمار کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے تھے ۔۔۔

رقص کے دوران میں ہی فگاتا نے اندر آ کر کہا "سب کچھ تیار ہے شہزادی عالی مقام ۔۔۔ آیئے اب باہر چلیں ۔۔۔ تاکہ آپ کے حکم کے بموجب پتھر کے چبوترے پر آخری رسم بھی ادا کر دی جائے ۔۔۔"

"کیسی رسم ۔۔۔؟" عازم الدین نے گھبرا کر سوال کیا۔

"قدیم مصری رسومات کے بموجب ۔۔۔ اس چبوترے پر جو کبھی ہیکل کے وسط میں تھا ہر دلہن تمام افراد کی موجودگی میں اپنی زبان دولھا کے منہ میں دیتی تھی اور اس کے بعد یہ اعلان کر دیا جاتا تھا کہ روحانی اتصال کے ساتھ ہی ساتھ دونوں کے جسم بھی ایک ہو گئے ۔۔۔ یہ ایک عجیب و غریب رسم تھی اور سہاگ رات سے قبل جسمانی اتصال کے عوامی مظاہرے کا یہ تصوّر بھی کچھ کم حیرتناک نہ تھا ۔۔۔ چنانچہ اپنے مقصد کو مکمل طور سے پورا کرنے کے لیے زلیخا نے بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی سسرال والوں کے سامنے بلکہ قبیلۂ فراز کے تمام افراد کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرے گی تاکہ ہر رسم کے بموجب احمس اسکا ہو جائے اور آیندہ زندگی میں کوئی اس پر اعتراض نہ کر سکے ۔۔۔"

عازم الدین اور طہرانی کو یہ رسم قطعی پسند نہ تھی ۔۔۔ انھوں نے کہا بھی کہ وہ

اس غیر مہذب اور لغو رسم کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں دیں گے۔ لیکن قبیلۂ فرانز کے آدمیوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہیں۔ اب زلیخا بھی خوش نظر آ رہی تھی، اور فگاتا بھی۔

باہر قبیلۂ فرانز کے آدمیوں کا وحشیانہ رقص بدستور جاری تھا، طبل اور ڈھول کی مہیب آوازوں اور کاہنوں کے مردہ گیتوں کی بھیانک لے نے ماحول کو بالکل قدیم معاشرہ کے سانچہ میں ڈھال دیا تھا۔ اور خیمہ کے اندر زلیخا احمس کی طرف ان نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ نظروں ہی نظروں سے اپنی محبت، اپنی پاکیزگی اور اپنی جوانی کا سارا رس احمس کی آنکھوں میں انڈیل کے رکھ دے گی۔

شادی کا تحفہ بطور طہرانی نے زلیخا کو ایک قیمتی انگوٹھی اور ڈاکٹر بیگ نے عطر کی ایک شیشی دی۔ اور اس کے بعد دلہن کا جلوس ہیکل کے تخت کی جانب روانہ ہو گیا۔

جلوس میں سب سے آگے فگاتا ایک ایسا بانس[1] لئے چل رہا تھا جس کے بالائی سرے پر لمبے بالوں کا ایک گچھا بندھا ہوا تھا، اس کے پیچھے بے ہنگم طور پر رقص کرتے ہوئے قبائلی تھے، پھر طبل بجانے والے تھے۔ نازک نازک قدم اٹھانے والی زلیخا تھی۔ برابر میں سلیم تھا اور اس کے پیچھے ہندوستانی سیاح۔ جس میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا ڈاکٹر بیگ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ اسکی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ وہ بیسویں صدی میں ۳½ ہزار سال

---

[1] اس قسم کا جھنڈا یوپی کے مشرقی اضلاع میں بابے میاں کا جھنڈا بطور آج بھی دیکھا جا سکتا ہے

پرانی ایک دیسی رسم کو دیکھ رہا تھا جو خواب میں بھی دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

بار بار زلیخا ـــــ احمس کی طرف اور سلیم زلیخا کی طرف دیکھتا، ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے دونوں کی بیقراری اپنی معراج پر پہونچ چکی تھی لیکن دونوں مجبور تھے ـــ دونوں جدید اور قدیم معاشرہ کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے کہ بس ـــ تھوڑی دیر اور ـــ اس کے بعد ہم دونوں ہر قسم کی پابندیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گے۔

ماحول کی دہشت بھی دھیرے دھیرے ختم ہو گئی تھی، اب ہر شخص مسرور تھا۔ زلیخا کے ذہن سے بھی اسپاتا کی منحوس دھمکی کا اثر زائل ہو چکا تھا وہ بھی خوش تھی، ـــ اور اسکا چہرہ دیکھ کر بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بارش سے نہایا ہوا گلاب کا کوئی سرخ پھول ـــ

دھیرے دھیرے خوشی اور مسرت میں ڈوبا ہوا یہ جلوس قدیم ہیکل کے چبوترے تک پہونچ گیا ـــ اور دولھا دلہن کی حیثیت سے زلیخا اور سلیم اس چبوترے پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے، قبیلہ کے تمام آدمیوں نے ان کو اپنے محاصرہ میں لے لیا ـــ اور فنگاتا نے آگے بڑھ کر پہلے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور پھر اپنی قدیم زبان میں کوئی منتر پڑھنے لگا، اب ہر طرف خاموشی تھی چاند کی کرنیں دولھا اور دلہن پر اپنی نورانی کرنوں کی بارش کر رہی تھیں اور فضا، میں ہر طرف فنگاتا کے منتروں کی آواز گونج رہی تھی، اور سلیم اپنی بیوی کی نیلی آنکھوں کی طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔

اچانک زلیخا نے انتہائی ہلکی آواز میں سلیم سے کہا ــــ "احمس ــــ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا لیکن میں نے غم و اندوہ کے تلخ اور طویل لمحات گذار کر وقت کا انتظار کیا ــــ اور جس طرح سمندر کی آغوش تلاش کرنے والی ندی کو کوئی نہیں روک سکتا، یا جس طرح سورج کی کرنوں کو کوئی نہیں ٹھنڈا کر سکتا اسی طرح مجھے بھی کوئی قوت میرے ارادے سے نہیں باز رکھ سکی، حد یہ کہ میں بیدار ہو گئی اور یہ کام تمھارے ہی ہاتھوں سرانجام پایا ــــ"

اور احمس نے اسی دھیمے لہجے میں جواب دیا "ہاں زلیخا ــــ یقین جانو تمھارا تصوّر مجھے بھی سدا بہار پھولوں کے کنج کی سیر کراتا رہا ہے میں عالم خواب میں تمھاری ہنسی کی آواز سنتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے چاند کی کرنوں سے سجے ہوئے تاروں پر کوئی نغمہ چھیڑ دیا گیا ــــ میں اکثر آنکھیں بند کر کے تمھارے حسن کے بارے میں سوچتا رہتا ــــ اور پھر خود ہی اپنے دل سے پوچھتا ــــ "یہ کیسی تصویر ہے جو میرے تصوّر کے ہر گوشے میں گھستی چلی جا رہی ہے ــــ اس اجنبی حسن میں ہزاروں شعلوں کی ایسی تپش اور سپیدۂ سحر کی سی پاکیزگی کہاں سے آ گئی ــــ"

ابھی غالباً سلیم کچھ اور کہتا کہ نگاتا نے اپنا منتر ختم کر دیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ دیا جس کے بعد ایک مرتبہ پھر اس چبوترے کے چاروں طرف رقص شروع ہو گیا ــــ اس مرتبہ رقص کی رفتار تیز تھی، طبل کی دھمک میں وارفتگی تھی، اور کاہنوں کے لبوں سے نکلے ہوئے گیتوں میں موسیقی کے ساتھ ہی ساتھ ایک تڑپ بھی تھی ــــ اور سلیم کا مسرت کے سمندر میں

لہریں مارتا ہوا ذہن صرف زلیخا کے مجلۂ عروسی کا، وہاں کی مدھم روشنی کا، پھولوں سے سجی ہوئی ایک سیج کا۔۔۔ اپنی سمٹی ہوئی محبوبہ کا،۔۔۔ اس کی سرگوشیوں کا اور لباس کی سرسراہٹوں کا تصور کر رہا تھا۔۔۔

کبھی وہ رقص کرتے ہوئے قبائلیوں کی طرف دیکھتا اور کبھی زلیخا کی طرف جس کے ملکوتی چہرے پر اس وقت ایک کنواری دوشیزہ کا تقدس اور ایک نئی نویلی دلہن کا اچھوتا وقار پوری شدت کے ساتھ نمایاں تھا۔۔۔ اور نہیں بیان کیا جا سکتا کہ اس وقت آسمان پر چاند سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑے۔۔۔ یا بے حس و حرکت کھڑے ہوئے کھجور کے گنجان درخت اس وقت کون سا منظر دیکھ رہے تھے۔۔۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس واقعہ سے متعلق تمام روحیں آسمان سے اتر کر نیچے ویرانوں میں آ گئی ہیں۔۔۔ مری ہوئی تہذیب ایک مرتبہ پھر زندہ ہو گئی ہے۔۔۔ محبت کا وہ معصوم اور ننھا چراغ جسے وقت کے ظالم ہاتھوں نے بجھا دیا تھا ایک مرتبہ پھر روشن ہو گیا ہے، ظلمتوں کے افق پر ایک معصوم محبت کا ستارہ طلوع ہو کر روشنی کی بارش کر رہا ہے اور چاروں طرف نور کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا ہے۔۔۔

اور اس ماحول میں سلیم کی شادی ہو رہی تھی۔۔۔ شادی۔۔۔ دنیا کا سب سے پاکیزہ رشتہ۔۔۔ وہ شادی جس کے بغیر آدمی کے نزدیک باغ عدن میں بھی کوئی کشش نہ تھی، اور ان کو فرشتوں کے گیت، خوش اطوار پرندوں کے چہچہے، پھولوں کی مسکراہٹ، بہار کے مہکے ہوئے جھونکے سب بے اثر اور

پھیکے معلوم ہوتے تھے۔ اور جب ان کی زندگی میں خدا کی سب سے قیمتی اور انمول تخلیق عورت کی صورت میں داخل ہوئی تو ان کی آہیں مسکراہٹوں میں بدل گئیں ان کا ہر دکھ اور ہر درد دور ہو گیا اور خوشی کے زمزموں سے باغ عدن کا گوشہ گوشہ جھوم اٹھا۔

آج سلیم بھی آدم کی اس خوشی سے روشناس ہو رہا تھا۔ آج اس کے بالکل قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ عورت ــــ جو کائنات حسن کا لازوال خزانہ ہے۔ جو انسانی راحت کا سرچشمہ ہے، جس کی ذات میں نیکی کا ہر جوہر موجود ہے اور جس کے طفیل میں ہی انسانیت کی تمام قدریں قائم اور باقی ہیں۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد رقص ختم ہو گیا ــــ ایک مرتبہ پھر ہر شئے خاموش تھی۔ اور اسی خاموشی کو چیرتی ہوئی نگاتا کی آواز بلند ہوئی۔

"اخناتون مصری کی آخری وارث ــــ مصری تہذیب کی زندہ تصویر، ــــ اور سیٹی اول کے دور کے جیتے جاگتے مجسمے ــــ تیرے غلاموں کا غلام ــــ تیری ہی طرح دیوی عشتار کی رحمتوں کا پیاسا نگاتا تیرے حضور میں قوت و حیات کا سب سے قیمتی تحفہ پیش کرنے کی اجازت مانگتا ہے"۔

اور زلیخا نے گردن ہلا کر یہ اجازت دیدی۔

اجازت پاتے ہی نگاتا نے ایک تیز خنجر فضا میں بلند کر کے اپنے شانے پر پوری قوت سے مارا۔ خون کا ایک فوارہ سا بلند ہوا نگاتا نے یہ خون اپنے دونوں ہاتھوں میں بھرا ــــ اور تکلیف کا اظہار کئے بغیر یہ خون چبوترہ پر

زلیخا کے قدموں کے قریب بکھیر دیا۔

نہ صرف سلیم بلکہ تمام ہندوستانی سیاح یہ خونی تحفہ دیکھ کر لرز گئے، لیکن زلیخا بالکل پرسکون رہی اور اس نے کہا۔ "قبیلۂ فراز کے سردار۔ بکھیر دیوتاؤں کی ہر ممکن رحمتوں کی بارش ہو۔ اور تجھے مرنے کے بعد آسمان کے اس گوشے میں جگہ ملے جہاں صرف خدا کے برگزیدہ بیٹے ہی قیام کرتے ہیں۔"

زلیخا کی زبان سے یہ دعائیہ کلمے نکلتے ہی ایک مرتبہ پھر رقص شروع ہوا فضا میں موسیقی پھیلی اور ماحول میں ایک مرتبہ پھر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لیکن یہ رقص زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ رقص رکا اور فنگا نا چیخ کر بولا۔ "شہزادی زلیخا۔ تومس سوم کی روح شادی کی آخری رسم دیکھنے کے لیے بیچین ہو رہی ہے۔ اس لیے اپنے شوہر حمس کے منہ میں اپنی زبان دیکر منحوس اسپاتا کے تابوت میں فنا کی آخری کیل ٹھونک دیجیے۔"

اب زلیخا نے عورت کی ازلی اور ابدی مسکراہٹ کے ساتھ سلیم کی طرف دیکھا۔ اس کے بالکل قریب آئی۔ اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتی اس کے تمناؤں اور حسرتوں سے بھرپور سینے سے لگائی۔ اپنی نازک انگلیاں اس کے ہاتھوں میں پھنسائیں اپنے یاقوتی لب اس کے لبوں سے ملائے، اپنی زبان اس کے پیاسے ہونٹوں پر پھیری اور ان لبوں کی چاشنی حاصل کرنے کے بعد اپنی زبان اس کے منہ میں داخل کر دی۔ سلیم نے بھی زلیخا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

رسم ادا ہوتی رہی۔ احمس زلیخا کی زبان چوستا رہا۔ طبل کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔ لیکن اچانک سلیم کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اسکی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اعصاب شل ہونے لگے۔ اور ابھی زلیخا کی زبان اس کے منہ میں ہی تھی کہ وہ کسی سوکھے درخت کی شاخ کی طرح سنگی چبوترہ پر گر پڑا۔

سلیم کے گرتے ہی عازم الدین ہمدانی اور ڈاکٹر بیگ چبوترے پر چڑھ آئے۔ لیکن وہاں اب کیا تھا۔ سلیم کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ کسی تیز زہر نے اس سے اسکی زندگی چھین کر اسے موت کے حوالے کر دیا تھا، وہ بالکل مردہ تھا۔ ڈاکٹر بیگ نے پہلے سلیم کے جسم کا طبی معائنہ کر کے اسکی موت کی تصدیق کی اور اس کے بعد موت کا فوری سبب دریافت کرنے کے لیے زلیخا کی زبان کا طبی معائنہ کیا۔

سلیم مر چکا تھا لیکن زلیخا زندہ تھی اور پتھرائی ہوئی ساکت و جامد نظروں سے مردہ سلیم کے اکڑے ہوئے جسم کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر بیگ نے انتہائی مغموم اور افسردہ لہجے میں اعلان کیا۔ "دوستو! مجھے بہت افسوس ہے کہ سلیم مر چکا ہے اور اسکی موت کا واحد سبب صرف وہ زہر ہے جو ہزاروں سال کی مسلسل نیند اور اعصاب کے سکوت و جمود نے زلیخا کے جسم کے ہر اس حصے میں پیدا کر دیا تھا جو خشک نہیں تر ہے۔ چنانچہ جیسے ہی سلیم نے شہزادی کی زبان چوسی۔ زہر اس کے جسم میں دوڑنے لگا۔ حد یہ کہ خون کے سرخ ذرات مر گئے اور زندگی اسے الوداع کہہ کر چلی گئی۔"

ڈاکٹر بیگ اپنا جملہ ختم کرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور عازم الدین دوڑ کر اپنے اکلوتے بیٹے کی لاش سے چمٹ گیا۔

لیکن دلھن بنی ہوئی زلیخا رونے اور آنسو بہانے کے بجائے ہنس دی۔ آنسو انتہائی غم کے اظہار کا ذریعہ ہیں مگر کچھ آنسو وہ بھی ہوتے ہیں جو آنکھوں سے بہنے کے بجائے سینے میں ٹھہر کر ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں اور انسان اس طوفان کو روکنے کے لیے قہقہہ مار کر ہنس دیتا ہے۔ ایک بھیانک اور درد انگیز ہنسی۔ لیکن یہ ہنسی بھی زیادہ دیر باقی نہ رہی۔ اس نے کہا "احمس۔ اے میرے محبوب، تم مجھے اپنی محبت کا میٹھا راگ سنائے بغیر اس دنیا میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ اور اسپاتا کی دھمکی بھی ثابت ہوئی۔ لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا کہ تم آسمان کی نیلی نیلی فضاؤں میں تنہا پرواز کر سکو۔

درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی ایک ہلکی آواز میں زلیخا نے مزید کہا۔ "احمس میں نے انتہائی قربانیوں کے بعد تمہارے وجود کو چاروں طرف سے سمیٹ کر اپنی زندگی میں شامل کیا تھا لیکن تمہیں پانے کے بعد تمام مسرتیں پلک جھپکتے میں زائل ہو گئیں اور اب میں پھر تنہا ہوں۔ لیکن اے میرے محبوب ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں تمہاری موت اور اسپاتا کی کامیابی کے سامنے خاموشی سے سر جھکا دوں اپنی شادی کے اس مسرت بھرے ہنگامہ میں اپنی امنگوں کو سسک سسک کر دم توڑتے دیکھتی رہوں اور اپنی آرزوؤں کے چشمے پر صبر کا پتھر رکھ دوں۔ اس لیے اے میری رفیق اگر تم

سُن سکتے ہو تو سن لو کہ میری آیندہ زندگی میرے بس میں نہیں رہی ۔ میں اپنا دل ویران یادوں کے حوالے نہیں کر سکتی ۔ تم مرنے کے بعد بھی میرے دل سے دور نہیں ہو سکتے ۔ میں تمھاری تصویر اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے لگا کر زندہ نہیں رہ سکتی ۔ تمھارے وجود اور تمھاری محبت کا عکس میرے ذہن سے کبھی نہیں مٹ سکتا ۔ تمھارے بغیر میں اپنی زندگی کو بنجر صحراؤں یا گرم ریگزاروں کے حوالے نہیں کر سکتی ۔ اور میری آنکھوں میں تمھاری فردوسی محبت کا جو چراغ ٹمٹما رہا ہے میں اسے نہیں بجھا سکتی ۔ احمس ۔ اے میری آرزوئے حیات کے درخشاں ستارے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ۔ لیکن اگر شکوہ ہے تو اپنی تقدیر کی لکیروں سے ۔

تم میرے جسم میں پھیلے ہوئے زہر کو امرت سمجھ کر پی گئے ۔ تم کامیاب و کامران اور بیقصور رہو ۔ لیکن میں ناکام بھی ہوں اور خطاوار بھی اور آئین وفا یہ نہیں ہے کہ موت کے بعد تمھارا ساتھ نہ دوں ۔

زلیخا نے یہ جملہ کہا اور دم بخود کھڑے ہوئے نگاتا کی کمر سے خنجر نکال کر اپنی چھاتی کی انتہائی گہرائیوں میں پیوست کر لیا ۔ اب زلیخا بھی سلیم کے قریب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی ۔

"نگاتا ۔ میرے قریب آؤ" دم توڑتی ہوئی زلیخا نے کہا "میرے پاس وقت نہیں کہ میں تم سے تفصیلی بات کر سکوں ۔ لیکن میری آخری وصیت غور سے سُن لو ۔ میرے مرنے کے بعد یہ تمھارا کام ہے کہ تم میری اور میرے احمس کی لاشوں کو میرے خاندانی قبرستان لیجاؤ اور ہم دونوں کو ایک ہی تابوت

تب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لٹا دو تاکہ احمس کو قریب رکھنے کی جو حسرت میں اپنی زندگی
میں پوری نہ کر سکی وہ مرنے کے بعد پوری ہو جائے ۔۔۔"

فگاتا ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ سب کے دیکھتے ہی دیکھتے زلیخا نے
زندگی کی آخری ہچکی لی اور سرد ہو گئی ۔۔۔

اور اس طرح یہ کہانی ختم ہو گئی ۔۔۔

لیکن یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اس لیے کہ کوئی نہیں جانتا کہ قبیلۂ فراز
کے پُراسرار آدمی فگاتا کی قیادت میں زلیخا اور احمس کی ناکام جوانیوں کی
لاشیں لیکر کہاں چلے گئے ۔۔۔ یہ لاشیں دفن بھی ہوئیں یا نہیں ۔۔۔ یا فگاتا نے ان
کی لاشوں کو ممی بنا کر ان کا مشترکہ تابوت کسی قدیم مقبرہ کے زمین دوز تہ خانے
میں رکھ دیا ۔۔۔ اور اس طرح کسی نئی کہانی کی بنیاد رکھ دی ۔۔۔

طہرانی، عازم الدین، ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر ارشد نے صرف یہ دیکھا
فگاتا کے آدمی ایک دولھا اور ایک دلہن کی لاشوں کو لیکر جن کے مُردہ
رُوں پر موت کا ہلکا سا بھی عکس نہیں تھا کھنڈرات کی پھیلی ہوئی تاریکی میں
تحلیل ہو رہے ہیں ۔۔۔ کسی انجانی منزل کی طرف ۔۔۔ یا ماضی کی طرف ۔۔۔
مستقبل کی طرف ۔

آج زلیخا دوسری مرتبہ مری تھی ۔۔۔ اور یہ زلیخا نہیں مری تھی تاریکی
تنہائی گہری نیند سے نکلتی ہوئی روشنی مری تھی ۔۔۔

آج زلیخا نے احمس کی خاطر دوسری مرتبہ خودکشی کی تھی ۔۔۔ اور اس کی
خودکشی نے جنت کے اس لافانی شعلہ کو بجھا دیا تھا جس کو اس نے اپنے لہو کی

چنگاری سے جلا کر ہزاروں سال تک باقی رکھا تھا۔

آج زلیخا کا جنازہ دوسری مرتبہ اٹھا تھا۔ اور اس جنازہ کے منظر نے جیسے پوری کائنات کا ماحول بدل دیا تھا۔ فضاؤں کو اداس کر دیا تھا خلاؤں میں موت کی خاموشی پھیلا دی تھی۔ وقت کی رفتار کو ٹھہرا دیا تھا، ستاروں کی چمک ماند کر دی تھی، چاند کی کرنوں کو رلا دیا تھا اور رات کو ایک المناک سکوت کے گہوارہ میں سلا دیا تھا۔

ہندوستانی سیاحوں کی یہ پارٹی قبیلۂ فراز کے غمزدہ افراد کے کاندھوں پر زلیخا اور احمس کی لاشوں کی روانگی کا یہ دلخراش منظر ساکت و جامد بتوں کی طرح دیکھتی رہی۔ لیکن جوان سال اکلوتے بیٹے کا باپ اس موت کو کیسے برداشت کرتا۔؟

عازم الدین کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ بھی بیہوش ہو گیا۔

• تمام شد •

سلامت علی مہدی
محلہ رسّی بٹاں ـــــ لکھنؤ

مورخہ ۱۳ اگست ۶۱ء۔